افشاں آفریدی

وفا ڈھونڈتے ہم ہو گئے

ناولٹ

او آخر نومبر کی وہ قدرے درمیانی خنکی والی صبح تھی۔ صبح صادق کا کہر اسورج کی شعاعوں کے سامنے شکست خوردگی کا اعلان کرتا فضا میں تحلیل ہو چکا تھا' لہٰذا اس وقت نرم نرم دھوپ دیواروں سے اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔

اس نے کیاری میں گوڈی کرتے کرتے یونہی نظر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں ازمیر کے آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دور سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا جو دیوار کے پار سے بخوبی نظر آ رہا تھا۔

"لگتا ہے' موصوف وعدہ کر کے بھول گئے ہیں' ادھر اماں اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ اب جوں ہی اندر جاؤں گی۔ ان کے سوال جواب شروع ہو جائیں گے' اور اگلے ہی لمحے چچی جان کے پورشن میں جانے کا حکم نامہ تھما دیں گی کہ جا کر ان کے لاڈلے کی گمشدگی کا پتا کر دو۔"

اس نے کچھ بیزاری سے سوچ کر گہری سانس لی اور دوبارہ کیاری پر جھک گئی' کیونکہ فی الحال اس کا اندر جانے کا موڈ نہیں تھا' ابھی گلاب کا پودا بھی مرجھانے کی تیاری میں تھا اسے توجہ دینا بھی ضروری تھی۔

"ہیلو کزن! کیا ہو رہا ہے؟"

کتنی ہی دیر گزرنے کے بعد اس کی خوشگوار آواز سنائی دی۔ اس نے بے اختیار سر گھما کر دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑا اپنی بدرنگی سیاہ جینز اور براؤن جیکٹ میں ملبوس حسب سابق مست ملنگ سا لگ رہا تھا۔

"آ گئے تم۔" ہاتھ جھاڑ کر وہ اٹھتے ہوئے کمر کے گرد لپیٹا دوپٹہ کھولنے لگی تھی۔

"نہیں' راستے میں ہوں۔" لاپروائی سے جواب دیتا وہ کین کی کرسی پر آ بیٹھا۔

"تم جیسے سست قدم لوگ راستے میں رہتے ہیں۔ ساری عمر منزل ان کے قدم کبھی نہیں چومتی۔" اس کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا۔ مڑ کر دوبارہ کام میں مگن ہو گئی۔

"خیر اب ایسا بھی نہیں' تم نے کبھی خرگوش اور کچھوے کی کہانی نہیں سنی' جیت ہمیشہ کچھوے ہی کی ہوگی۔" ازمیر حسب عادت اطمینان سے کہہ کر

مسکرانے لگا تھا۔

"چلو کسی بہانے سہی، تم نے خود کو کچھوا تو تسلیم کیا۔" اس کا انداز ستانے والا تھا۔

"مگر مقابل ازمیر ہمدانی تھا جس کے چہرے کی مسکراہٹ گویا خدوخال کا حصہ تھی۔

"اور تم نے مجھے فان۔۔۔" ٹھہرے لہجے میں اپنی بات کہہ کر ایک ساعت کے لیے رک کر اس کے تاثرات جانچنے کے بعد اس نے اپنی بقیہ مسکراہٹ ہونٹوں تلے داب لی تھی۔ "بائی دا وے تم کیا کر رہی تھیں یہاں۔"

"سرنگ کھود رہی تھی۔" اب کے اس نے بڑے پرسکون انداز میں جواباً کہا تھا۔ ازمیر قہقہہ لگا کر ہنستا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

"خاصی گہری کھود رہی ہو۔ کیا اس کے رستے لاہور جانے کا ارادہ ہے۔" اس کے عقب سے جھانکتا وہ حسب عادت بجری پر سے اتر گیا تھا۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا، اس کے دائیں جانب بڑے سکون سے پنجوں کے بل بیٹھا کیاری میں دیکھ رہا تھا۔

"تم ہر وقت میرے غم میں کیوں گھلتے رہتے ہو۔"

"اس لیے کہ تم میری کزن ہو اور اس لیے بھی کہ ہم تم بچپن کے اچھے دوست ہیں پھر محلے دار بھی ہیں، تمہارا ہمسایہ بھی، ہم کبھی کلاس فیلوز بھی رہ چکے ہیں اور سب سے بڑھ کر تم میری۔۔۔"

"اچھا بس بس۔۔۔ اتنا لمبا طومار مت باندھا کرو، جاؤ اندر جا کر دادی کو یہ کتھا چونا لگاؤ۔ صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔" اس نے یکدم ہی رخ پھیر لیا تھا۔ ازمیر شرارت سے سر کھجاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔

"صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتیں کہ صبح سے تم میرا انتظار کر رہی تھیں، جب ہی تو گوڈی کرنے کے بہانے گیٹ پہ آ بیٹھیں۔"

"چچ۔۔۔ چچ کتنے خوش فہم ہو تم ازمیر! سچ بہت افسوس ہوتا ہے مجھے تمہارے حال پر۔"

"زیادہ افسوس مت کرو کہ میرا یہی حال جلد ہی تمہارا مستقبل بن جائے گا۔" یکدم وہ سنجیدگی کی چادر لپیٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ سلگ اٹھی۔

"خوش فہمیوں کے پر باندھ کر بندہ زیادہ دیر فضا میں اڑ نہیں سکتا جب سیدھا نیچے آ کر گرتا ہے تو دماغ واپس ٹھکانے پر لوٹ جاتا ہے۔ مگر تم شاید اسی تجربے کی تلخی اپنی زندگی میں گھول کر دیکھنا چاہتے ہو۔"

بظاہر وہ بڑے سکون سے مخاطب تھی مگر دل ہی جانتا تھا کہ کس طرح یہ فضول باتیں وہ برداشت کر رہی تھی۔ ازمیر نے بے دھیانی میں اس کی بات سن کر جیسے کان پر سے مکھی اڑائی۔

"دیکھتے ہیں، تجربے زندگی میں تلخی گھولتے ہیں یا شیرینی، فی الحال تو یہ وقفہ خواب ہی بہت ہے۔ اینی وے۔ تم بھی اب یہاں سے اٹھ جاؤ مٹی میں کھیلتی بالکل گندی بچی لگ رہی ہو، تمہارے لاہوری بابو تمہیں اس حلیے میں دیکھ لیں تو پہلی فرصت میں ہی دل کی بات زبان پر لے آئیں۔" وہ اب کی بار بھی نہ چوکا تھا۔ مگر اس نے قصداً "نظر انداز کیا۔

"فضول باتیں چھوڑو یہ بتاؤ تم آئے کہاں سے ہو، دروازہ تو بند ہے۔"

"جب دروازے بند ہوں تو مجبوراً" دیواریں پھلانگنی پڑتی ہیں۔"

واپس کین کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ پھر اسٹائل سے بولا تو اس کا دل چاہا ازمیر کا سر توڑ دے۔

"تمہیں ایسی کیا مجبوری تھی دروازہ ناک نہیں کر سکتے تھے۔" اس کی باتوں سے وہ ٹھیک ٹھاک بھنا گئی تھی۔

"میں دستک دیتا تو کیا تم واقعی دروازہ کھول دیتیں؟" ترچھی نظروں سے دیکھتا وہ اسے سخت زہر لگتا تھا مگر یہ بات ظاہر کر کے وہ ہمہ وقت کے لیے توپ کا دہانہ اپنی طرف تو نہیں کروا سکتی تھی اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ نظر انداز کر دیا جائے۔

"ابھی جمعدار آیا تھا جب اس کے لیے گیٹ کھل سکتا ہے تو تم میں ایسی کیا برائی ہے کہ تمہیں دروازے سے دھکے دے دیے جائیں۔" مڑ کر اس نے دوبارہ سے مٹی کھودنی شروع کر دی تھی۔

"ہائے۔۔۔ میری قسمت"

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنساتے ہوئے اس نے بڑے دل گیر انداز میں شعر پڑھا تھا۔ ایما کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ تیر گئی۔ جسے دبا کر اس نے موضوع بدل دیا تھا۔

"چچی جان کیا کر رہی تھیں اس وقت؟"

"وہ مسز اشفاق آئی ہوئی ہیں، ان کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔" مسز اشفاق کے ذکر پر اس کا لہجہ کڑوا ہو گیا تھا، ایما کھل کر ہنس پڑی۔

"مسز اشفاق آئی ہیں تو تم کیوں جل جل کر کوئلہ بن رہے ہو۔"

"سخت زہر لگتی ہیں مجھے یہ مسز اشفاق۔" وہ سخت بیزار تھا۔

"اور ان کی بیٹی۔۔۔؟ وہ کیسی لگتی ہے۔"

"زہر سے بھی بدتر، صبح ہی صبح فضول ذکر مت چھیڑو تم۔" اب [illegible] غصے میں کہہ رہا تھا، ایما کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

"حیرت ہے، ایک لڑکی کا ذکر ہو رہا ہے اور "تم" اپ سیٹ ہو رہے ہو۔" اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں، "جب کہ وہ لڑکی تو بے حد چارمنگ ہے۔"

"اتنی ہی چارمنگ ہے تو اپنی بھابھی کیوں نہیں بنا لیتیں، آصف سے صرف چار سال ہی تو بڑی ہو گی۔" وہ کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

"توبہ کرو، یہاں میرے معصوم بھائی کا کیا ذکر۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"ہوں۔۔۔ اپنے بھائی کا تو کوئی ذکر ہی نہیں اور میری ہی فکر ہو رہی تھی۔"

"کیا کریں۔۔۔ آخر کو تمہارا بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے نا، نہیں تو ٹھکانے لگانا ہے۔" اس کا انداز ہمدردی ظاہر کرنے والا تھا۔ ازمیر جھلس ہی گیا مگر [illegible] لہجے میں بولا۔

"ایسی ہی فکر ہے تو خود ہاں کیوں نہیں کر دیتیں، بقول انگریزوں کے چیریٹی بگنز ایٹ ہوم۔" اس نے آج خوب پکڑا تھا اسے۔ ایما کا دل تو چاہا خوب کرارا سا جواب دے مگر اس طرح اسے شہہ ملتی اس لیے ہنسنے لگی۔

"دن بہ دن لڑاکا بیویوں والے سارے گن پیدا ہوتے جا رہے ہیں تم میں، آج کل کس کی کمپنی میں رہ رہے ہو۔"

"تمہاری۔۔۔!" جواب برجستہ تھا وہ تبسم کو پھیلنے سے روک نہ سکی۔

"ویسے تمہیں سوجھی کیا تھی جو اس سردی میں یہاں آ کر بیٹھ گئی ہو، کہیں ہماری والدہ کا سایہ تو نہیں پڑ گیا تم پر۔ ان کا بس چلے تو لوگوں کے گھر مسمار کر کے وہاں بھی جنگلات اور باغات اگا دیں۔"

"جی نہیں میرا خود دل چاہ رہا تھا۔ گارڈننگ کتنا پرلطف کام ہے۔" اس نے گیندے کے پودوں کی جڑوں سے خشک پتے اٹھاتے ہوئے دلچسپی اور سرشاری سے کہا پھر سر اٹھا کر اسے بھی بلانے لگی۔

"آؤ ناں تم بھی مل کر کرتے ہیں۔"

"معاف رکھو مجھے، سخت الجھن ہوتی ہے مجھے گیلی مٹی سے۔ ادھر ہماری والدہ محترمہ سارا دن ہاتھ میں کھرپی ہوتی ہے یا پودوں کو پانی دینے کے لیے پائپ، انہیں کسی دوسرے پوز میں دیکھنے کی حسرت لیے ہی بوڑھا ہو جاؤں گا۔" اس نے قصداً "بیزاری" کا مظاہرہ کیا تھا۔

"تب ہی تو کہہ رہی ہوں، مسز اشفاق کی بیٹی بہت اچھی رہے گی تمہارے لیے، جس کے ایک ہاتھ میں لپ اسٹک اور دوسرے میں مسکارا ہو گا۔ منظر بھی بدل جائے گا اور مقابل کی دلچسپیاں بھی۔ سوچو ذرا زندگی میں میک اپ کٹ کے رنگ در آئیں تو کیسی لگے گی لائف۔۔۔ بالکل لیٹسٹ ماڈل کی طرح تر و تازہ اور دلفریب۔"

"جی بالکل! اور جوں ہی یہ میک اپ اترے گا، چیخیں نکل جائیں گی میری۔ ایسی ہمدردی اور مشورے سے میں باز آیا۔" وہ شکل بگاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایما

UrduPhoto.com

مسکراہٹ چہرے پر سجا کر کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ لان کی طرف کا دروازہ کھول کر شیما نکل آئی۔

"ارے ازمیر بھائی! آپ آگئے ہیں۔ اماں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"ہاں بس اندر ہی جا رہا تھا۔" وہ پاس پڑی کرسی سے شاپر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"شیما! تمہیں بھی بلا رہی ہیں اماں۔ ان کی مسواک کہاں رکھ دی ہے تم نے۔"

"وہیں پاندان میں تو رکھی ہے۔"

"انہیں ہمیشہ کی طرح نہیں مل رہی۔ اب تم ہی جا کر تلاش کر کے دو انہیں۔ یوں بھی جب تک وہ تمہیں دن میں بیس پچیس مرتبہ اپنے پاس بلا کر بٹھا نہ لیں انہیں چین نہیں آتا۔" شیما نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تو اس نے مسکرا کر تفاخر سے ازمیر کی طرف دیکھا جو قصداً انجان بنتا آگے بڑھ گیا تھا۔

"ہونہہ جیلس نہ ہو تو۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ شیما کے ساتھ اندر چلی آئی۔

"اماں کو تمہاری بہت عادت پڑتی جا رہی ہے۔ ایسا کرو فار گاڈ سیک انہیں اپنے بغیر رہنے کی ٹریننگ ابھی سے دینی شروع کر دو۔ نہیں تو تمہاری شادی کے بعد جو عنقریب ہونے والی ہے، اماں بہت فیل کریں گی۔ ساتھ میں ہماری شامت بھی آجائے گی۔" ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شیما اسے نصیحتیں کر رہی تھی۔ وہ کیا کہتی محض پر سوچ انداز میں سر ہلا دیا۔

جس لمحے وہ اماں کے کمرے میں داخل ہوئیں ازمیر کا لایا ہوا لفافہ چوپائی پر رکھنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اس نے پاندان سے مسواک نکال کر اماں کے ہاتھ میں تھما دی۔

"ارے یہ کہاں سے ملی۔" ان کا سادہ سا چہرہ بڑا معصوم لگ رہا تھا۔

"وہیں تھی پاندان میں۔ اماں! آپ ٹھیک سے تلاش تو کر لیا کریں۔" شیما قدرے خفگی سے بولی تھی۔ اماں کا چہرہ لمحے بھر کے لیے تاریک ہو گیا۔

"چپ کرو تم شیما! اور جا کر چائے بناؤ ازمیر کے لیے۔" اس کے پاس وہاں سے بھگانے کا یہی معقول بہانا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ بھی کی تو شیما جھلا کر پلٹ گئی۔

"ویسے اماں! آپ کو صبح کے دس بجے یہ مسواک کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ کیا چاشت کی نماز بھی پڑھنی شروع کر دی ہے آپ نے؟"

"دیکھ لو، کتنی پرہیز گار اور نیک خاتون ہیں ہماری دادی اور ایک تم ہو کہ جمعہ کو بھی مارے باندھے ہی جاتے ہو مسجد۔" اس نے شیما کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ازمیر سے بحث شروع کر دی۔

"ہاں تو چلا تو جاتا ہوں۔ وہاں لاہور میں تو سنا ہے لوگ عید کی نماز بھی دس سال میں دو بار ہی پڑھتے ہیں۔"

"تو تم ان سے کیوں مقابلہ کرتے ہو۔ ان کی مرضی جو کریں۔"

"ہاں بھئی اب میرا ان سے کیا مقابلہ۔ کہاں میں اور کہاں وہ۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا تو وہ جھنجھلا گئی۔

"دیکھ رہی ہیں اماں اسے۔ یہ خوامخواہ سجاد کو ہر بات میں گھسیٹ لاتا ہے۔"

"گھسیٹ تو تم لائی ہو اسے میرے اور اپنے درمیان۔" اماں کی فہمائشی نگاہوں کو نظر انداز کیے وہ قدرے سرگوشی میں بولا تھا۔ وہ بھنا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

دس بج رہے تھے۔ پاپا اور امی کا یہی ناشتے کا ٹائم ہوتا تھا۔ کچن میں پہنچی تو شیما چائے بنا چکی تھی۔ اس نے بقایا لوازمات تیار کیے اور پاپا کے پاس جانے لگی۔

"تم ازمیر کو چائے دے دینا۔ میں ذرا پاپا کے پاس جا رہی ہوں۔"

"یہ کپ امی کا بھی لے لو۔ دیتی ہوئی چلی جانا۔ میں اب کالج جاؤں گی۔" شیما کا پریکٹیکل ڈے تھا سو اسے اب جانا تھا۔

"نہیں میں اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔ حد درجہ بے ہودہ انسان ہے۔ کسی دن میرے ہاتھوں

قتل ہو جائے گا۔" اس نے غصے میں دانت کچکچائے۔

"یہ قتل تو گزشتہ بائیس سال سے ہو رہا ہے۔ آخر تم یہ کام کر کیوں نہیں چکتیں۔" خلاف توقع شیما نے بڑی سنجیدگی سے پوچھ لیا تھا۔ وہ مصنوعی غصے سے اسے گھورتی باہر نکل گئی۔

"اسٹوپڈ۔ ازمیر بھائی کی فیلنگز بھی نہیں سمجھتی۔ اگر پہلے سمجھ جاتی تو شاید سجاد بھائی کے لیے ہاں ہی نہ کرتی یا شاید... اُفوہ دفع کرو۔ میں بھی کیا سوچنے لگی۔" یکدم خود کو سرزنش کر کے شیما نے کچن سے اماں کے کمرے کی راہ لی تھی۔ دیر ہو رہی تھی اسے۔

"پاپا پلیز! اب یہ اخبار بند کر دیں اور ناشتہ کر لیں۔" وہ کمرے کے دروازے سے ہی شور مچاتی داخل ہوئی تھی۔

"تھینکس بیٹا۔ یہاں رکھ دیں۔" وہ نیوز پیپر میں گم تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر اخبار ان کے ہاتھ سے لیا تو وہ مسکرا دیے۔

"امی نے ناشتہ کر لیا؟" حسب معمول سوال ہوا۔

"جی! سوائے امی کے سب نے کر لیا ہے۔ آپ بھی امی کے ساتھ ہی کرنا چاہیں تو ڈائننگ روم میں چلتے ہیں۔" کچھ سوچ کر اس نے کہنے کی ہمت کر ہی لی تھی۔

"بیٹا! آپ جانتی تو ہو کہ میرے اور آپ کی امی کے معمولات ایک دوسرے سے بہت مختلف رہے ہیں ہمیشہ سے۔ ہم میں بہت فاصلے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پاپا! لیکن کیا ان فاصلوں کو سمیٹا نہیں جا سکتا۔" وہ کچھ اداس سی ہو گئی تھی۔

"فاصلے سمیٹنے کے لیے ضروری ہے دو طرفہ خواہش اور دونوں فریقین کی باہمی رضامندی۔ اگر یہ سفر اکیلے ایک فریق کو ہی کرنا پڑ جائے تو کچھ دیر بعد ہمت جواب دے جاتی ہے۔"

"مگر ایسا کیوں ہوتا ہے پاپا! جب انسان اپنی فیملی، اپنے پیرنٹس کے خلاف جا کر ایک فیصلہ کرتا ہے تو پھر سمجھوتے کی راہ چلنا کیوں بھول جاتا ہے... امی خالصتاً آپ کی چوائس ہیں۔ آپ کو نہیں لگتا کہ اس طرح

UrduPhoto.com

ایک دوسرے سے لاتعلق رہ کر آپ ان سب لوگوں کو جو آپ کے فیصلے کے کبھی خلاف تھے ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔" آج کے دن اس کا بحث کا موڈ تھا۔ ازمیر نے ذرا دیر پہلے جو فضول گوئی کی تھی اس کے نتیجے میں اس کے اندر ردعمل پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"زندگی اسٹیج پر ہونے والا ڈرامہ نہیں ہے کہ پینتالیس یا پچاس منٹ کے بعد ختم ہو جائے گا۔ لڑی کڑی جڑ کر مہینوں اور سالوں پر محیط ایک عرصہ دراز ہے اور اتنے طویل عرصے تک کوئی بھی حالت تمثیل میں نہیں رہ سکتا۔ شروع میں ہم نے آپ کی امی کے ساتھ نبھانے کی بڑی کوشش کی مگر اپنی عائلی زندگی کا جھوٹا بھرم زیادہ دیر رکھ نہ سکے۔ ان فیکٹ بیٹا! یہ جھوٹا بھرم بڑی خطرناک چیز ہے۔ اندر ہی اندر بندے کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ ظاہرداری میں ہنستا ہے مگر اس کا باطن آزردگی میں گھرنے لگتا ہے۔ ایسے خول جب چٹختے ہیں تو بندہ بھی ٹوٹ جاتا ہے اس لیے ہم نے ایسی کوشش ہی ترک کر دی۔"

ان کا مطمئن لہجہ گہرائی لیے ہوئے تھا۔ وہ قصداً" خاموش ہو گئی۔ پاپا کے دلائل اسے ہمیشہ ہی قائل کر لیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی اس نے گہری سانس بھر کر ان کی توجہ ناشتے کی طرف مبذول کی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر ٹیرس پر آ گئی۔

ریلنگ سے نیچے جھانکا تو ازمیر اپنی بائیک پر شیما کو کالج ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔ وہ بے خیالی میں انہیں دیکھنے لگی تو کوندا سا جیسے ذہن میں لپکا۔ ایک بے اختیارانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر اتر آئی۔ چچی جان حسب معمول اس وقت بھی اپنے لان میں نظر آ رہی تھیں۔ کیاری میں لگی چھوٹی چھوٹی کونپلیں ان کی توجہ کا مرکز تھیں۔

"والدین بھی تو مالی کی طرح اپنے بچوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ ایسے میں باد سموم کے جھونکے جب انہیں نقصان پہنچائیں تو ان کے دل کیسے برداشت کر پاتے ہوں گے۔"

اماں کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا جنہیں پاپا کی ناخوشگوار زندگی نے ایک مستقل روگ لگا دیا تھا۔

"ایما۔۔۔ ایما!" امی کے پکارنے پر اس نے قدرے چونک کر نیچے جھانکا تھا۔ وہ اسے بلا رہی تھیں۔ سجاد کی امی کا لاہور سے فون آیا تھا۔

اگلے ہی پل وہ دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتی نیچے تھی۔

"اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔" اماں نے اسے ریسیور کان سے لگائے خالہ جان (سجاد کی امی) سے خوشگوار لہجے میں بات کرتے دیکھا تو دعا دی۔

"بس خالہ جان! اس سال فائنل ایگزام دے لوں تو پھر فراغت ہی فراغت ہے۔ آپ آئیے ناں کراچی۔ بیچ آپ سے ملے بہت دن ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور سجاد کیسے ہیں۔" وہ روانی سے محو گفتگو تھی اور وہاں سے اسی تواتر سے جواب آ رہا تھا۔

UrduPhoto.com

سجاد بوں کی آمد کے ساتھ ہی اماں کے فرمائشی کھانوں کا دور بھی شروع ہو جاتا تھا۔ آج اس نے پائے بنائے تھے۔ امی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں سو ایسے مرغن کھانوں سے ان کا پرہیز چلتا تھا اور پرہیز تو ان کا ہر اس چیز سے ہی تھا جو اماں اور پاپا کو پسند ہوتی۔

روایتی عورت والی بہت کم خصوصیات تھیں ان میں۔ شادی کے بعد انہوں نے خود میں ایک فیصد تبدیلی بھی پیدا نہیں کی تھی۔ سمجھوتے اور مصالحت جیسے الفاظ ان کی لغت میں عنقا تھے۔ ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنے کا مجاز ہے۔ ایسا ان کا کہنا تھا۔ اور اپنے اسی اصول پر کاربند رہتے ہوئے انہوں نے نہ صرف اپنی زندگی گزاری تھی بلکہ اولاد کو بھی اسی طرح پروان چڑھایا تھا۔

شیما فطری طور پر ان سے قریب تھی جبکہ ایما کا زیادہ وقت دادی اور پاپا کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس امر سے وہ بخوبی واقف تھیں کہ امی کو اس کا دادی کے ساتھ زیادہ میل جول پسند نہیں لیکن چونکہ انہوں نے کبھی

اسے اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں دی تھی اس لیے وہ قصداً" انجان بن جاتی تھی۔

خالہ جان کے بیٹے سجاد کے لیے انہوں نے چاہا کہ وہ ہامی بھر لے تاکہ دادی اور پاپا سے قدرے دور چلی جائے جنہوں نے اس کے وجود کے آگے انہیں بالکل اہمیت دینی چھوڑ رکھی تھی۔

ایما کی پیدائش کے بعد پاپا نے خود کو اس میں گم کر لیا تھا۔ اب انہیں اپنی نصف بہتر سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ دادی بھی اس کی دیوانی تھیں اور یہ محبت دھیرے دھیرے اس میں بھی سرایت کرتی چلی گئی تھی۔

امی کی نیچر میں ضد اور ہٹ دھرمی اس قدر تھی کہ چچی جان جو خاصی ملنسار اور گھلنے ملنے والی خاتون تھیں زیادہ دن ساتھ نہ رہ سکیں۔ اس لیے انہوں نے ہی بقیہ رہی سہی عزت اور توقیر کو بچانے کے لیے برابر والا پورشن خرید کر چچا جان کے حوالے کر دیا۔ اب گھروں کے درمیان دیوار ضرور تھی مگر آپس کا احترام اور لحاظ قائم تھا۔

تاہم چچی جان کا امی سے کچھ ایسا دل کھٹا ہوا کہ پھر ان کے رویے میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ ایما اور شیما سے بھی وہ بہت کم سیدھے منہ بات کرتیں۔ زیادہ تر تو تیوریاں ہی چڑھی رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ تینوں بہن بھائی ازمیر کے گھر کم ہی جاتے تھے۔ البتہ وہ ہر روز آ دھمکتا۔

ایما سے اس کی بچپن کی دوستی تھی۔ اسکول کے دور میں وہ ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ کچھ یہ تھا کہ امی ازمیر سے نسبتاً" کم چڑتی تھیں اس لیے اس کے ساتھ کھیلنے کودنے میں وہ آزاد تھی تاہم دوسری طرف چچی جان کی بیزاری عروج پر رہتی۔ لیکن چونکہ وہ ازمیر کی دوست تھی اس لیے چچی جان سے ہمیشہ احترام سے پیش آتی جس سے ذرا دیر کے لیے ان کے ماتھے کی شکنیں دور ہو جاتی تھیں۔

لیکن پھر جلد ہی ایسا کچھ ضرور ہو جاتا کہ امی اور ان کی آپس میں پھر سے ٹھن جاتی اور اس کی محنت سے مٹائی ہوئی یہ شکنیں ان کے ماتھے پر پھر سے ابھر آتیں۔ سو اب تو یہ ہو گیا تھا کہ ان کے یہ تیور مستقل مہمان کی طرح آ براجمان ہوئے تھے جنہیں اماں مختلف حربوں سے مسکراہٹ میں بدلنے کی کوشش کرتیں۔ یہ الگ بات کہ اس کا خاک بھی اثر نہ ہوتا۔ چچی جان کو بنیادی شکایت جٹھانی سے تھی ساس سے نہیں۔

ابھی بھی اماں کے کہنے پر وہ پائے کی ڈش لے جا رہی تھی کہ ازمیر نے گیٹ کے قریب ہی اسے روک لیا۔

"خیریت۔ یہ سواری باد بہاری کیا ہمارے گھر جا رہی ہے؟" اشارہ ڈش کی طرف تھا۔

"ظاہر ہے اب اگر ہم نے تمہیں کھلائے بغیر پائے کھا لیے تو کسی کو بھی ہضم نہیں ہوں گے۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر لے جا رہی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ اچھی بات ہے۔ مل جل کر کھانے سے محبت بڑھتی ہے۔"

"محبت نہیں برکت۔۔۔" اس نے تصحیح کی۔

"محبت بھی بڑھ سکتی ہے اگر بندہ چاہے تو!" وہ پھر پٹری سے اترنے لگا تھا۔

"اور بندے کو عقل بھی آ سکتی ہے اگر بندہ چاہے تو۔" اس کا لہجہ ہنوز پرسکون تھا۔

"عقل اور جنوں ایک کشتی میں سوار نہیں ہو سکتے ایما ڈیر! اور تم تو جانتی ہی ہو کہ میرا تعلق جنوں خیز جذبوں سے ہے۔" یکدم وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹتے ہوئے اسے گہری نظروں کے حصار میں لیا تو وہ جلبلا گئی۔

"گویا تم نے عقل سے پیدل ہونے کا واضح اعتراف کر ہی لیا۔ تو اب یہ بھی سن لو کہ میں اہل خرد کی دل سے تعظیم کرتی ہوں اور زندگی میں انہیں اہل دل پر ہمیشہ فوقیت دیتی رہوں گی۔" کھرے اور روکھے لہجے میں کہہ کر اس نے سائیڈ سے نکل جانا چاہا مگر ازمیر چوکنا تھا۔

"تمہاری گڈ بکس میں آنے کی شرط ہے یہ؟"

قدرے جھجک کر گھرے لہجے میں سوال کیا۔

"یہی سمجھ لو۔ اور اب ہٹو میرے راستے سے۔" وہ جھلائی۔

"نہ ہٹوں تو۔" اس کا موڈ بدلتے دیکھ کر وہ بھی چڑ گیا۔

"تو میں تمہیں دھکا دے کر آگے بڑھ جاؤں گی۔ بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو تم۔ بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں رہی ہے۔"

"اچھا بس بس۔ دس ماہ کی بڑائی کا زیادہ رعب مت جمایا کرو مجھ پر۔ یوں بھی تمہیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے بڑی ہو۔ سات آٹھ سال چھوٹی ہی لگتی ہو۔" ازمیر کی استہزائیہ ہنسی ہمیشہ کی طرح اس کی جان جلا گئی۔

"ہاں تو تمہاری طرح بے کار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر اور مفت کی روٹیاں توڑ کر میں نے اپنا وزن نہیں بڑھا لیا کہ عمر سے دو گنی لگنے لگوں۔"

"ہوں۔ سو تو ہے۔ بالکل نازک سی گڑیا لگتی ہو۔" اس پر اس کے غصے کا ذرا اثر نہ ہوتا تھا۔ ڈھٹائی سے توصیفی نظریں اس کے سراپے پر ڈالیں جو گہرے نیلے لیلن کے سوٹ میں سادہ سا حلیے میں بھی پرکشش لگ رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ۔" اس کی فضول حرکت پر وہ غصے سے بل کھا کر واپس مڑ گئی۔ یکدم ازمیر کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ وہ واپس پلٹ کر گھر کے اندر جا رہی تھی۔ ایک جست میں جا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ازمیر! چھوڑو میرا ہاتھ۔ نہیں تو میں یہ سارا سامان تمہارے سر پر انڈیل دوں گی۔" اس کے ہاتھ پکڑتے ہی وہ بری طرح بپھر کر چلائی تھی جس کا ازمیر پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ فوراً "چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ تاہم اس نے چہرے پر معصومیت کے سارے تاثرات جمع کر لیے تھے۔

"آئی ایم سوری یار! میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے مذاق۔" وہ بری طرح غرائی تھی۔

"پھر تمہارا کیا ہو گا؟" ادھر فکریں لاحق تھیں۔

"اونہہ۔" وہ تلملا کر آگے بڑھ گئی تو ازمیر کے لبوں پر مسکراہٹ در آئی۔

(عجیب ہو تم بھی ایما عباد! جذبوں سے بھاگتی ہو۔ حالانکہ ان سے مفر نہیں۔ خواہ یہ اپنے دل میں بیدار ہوں یا کسی اور کے وجود میں تباہیاں مچائے رکھیں۔ اگر تم سے منسوب ہیں تو پھر تمہیں ان کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا......) جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے سوچا تھا پھر سیٹی پر my love for you Nothing gona change کی دھن بجاتا اندر چلا آیا جہاں وہ اماں کے سامنے اس کی شکایتوں کا پلندہ لیے بیٹھی تھی۔

وہ بھی ڈھٹائی کا عظیم الشان مظاہرہ کرتا اس کے مقابل اطمینان سے آ بیٹھا اور سر ہلا کر کچھ اس طرح تائید کی کہ وہ غصے سے کھولتی وہاں سے پیر پٹختی چلی گئی۔

"کیوں ستاتے ہو بیٹا اسے۔ چند دنوں کی مہمان ہے اس گھر میں۔ پھر وہ بیاہ کر چلی جائے گی تو یاد کرو گے اسے۔" اماں نے اس کے جانے کے بعد گہری سانس بھر کر اس کی طرف رخ پھیرا تو وہ ضبط کی کوشش میں آنکھیں بھینچ گیا۔

"جو چاہو میرے بچے! زندگی میں ہر شے انسان کو حاصل نہیں ہو جاتی۔" اماں اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

"وہ کوئی شے نہیں ہے اماں! ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں نے بچپن سے آج تک ضد نہیں کی مگر وہ میری ضد، میری خواہش اور میرا عزم بنتی جا رہی ہے۔ مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ میرا ساتھ نہیں دے رہیں۔" فرط ضبط سے ازمیر کی آنکھوں میں سرخ ڈورے کھنچ گئے تھے۔ کنپٹی کی رگ پھول رہی تھی۔

"میرے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے بچے! عباد اور دلہن کی ناکام زندگی نے اسے جذبوں کی بنیاد پر بنائے جانے

والے رشتوں سے بدول کر دیا ہے۔ یوں بھی وہ تمہارے اور اپنے مابین دس ماہ کے فرق کو اور خصوصاً" تمہاری ماں کی بیزاری کو ذہن سے نکال نہیں پاتی۔" اماں کی مجبوری ان کے لہجے کو بھگو گئی تھی۔

"اور سجاد کی لاتعلقی اور بیزاری کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔" وہ لکڑی کی طرح چیخ رہا تھا۔

"اچھی اور شریف بچیاں والدین کے فیصلوں کا اسی طرح مان رکھتی ہیں۔ دلہن نے اپنی بہن کو قول دیا ہے۔ وہ اپنی ماں کا قول جانے نہیں دے گی۔ سجاد بھی دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ڈھل جائے گا۔ عورت کی خدمت و ریاضت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اسے ایما کی طرف پلٹنا ہی پڑے گا۔ تم بھی خود کو حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر راضی کر لو بیٹا۔"

وہ اسے سمجھا رہی تھیں جس کے سر پہ عشق کا بھوت سوار تھا۔ جواباً" وہ اکھڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"سمجھوتے کمزور لوگ کرتے ہیں اماں! اور میں کمزور نہیں۔ یوں بھی رشتے داریوں کو خصوصاً" ایسے نازک رشتوں و محبت سے جڑا [illegible] زندگی گزر سکتی ہے۔ سمجھوتے کی [illegible] زندگی نہیں چاہیے مجھے۔"

انتہائی غصے میں کتنا وہ تیزی سے قدم باہر کی طرف بڑھا گیا تو اماں جیسے اپنی جگہ ہول کر رہ گئیں۔ دونوں ہی بچے انہیں عزیز تھے اور ان کے مفاد اور خوشیاں عزیز تر۔ مگر وہ سوائے دعا کے کیا کر سکتی تھیں سو تسبیح اٹھا کر دانے گھمانے لگیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

محبت اور وہ بھی غیر مشروط
بہت مشکل ہے ایسے مہربان سے

ازمیر پھر دو دن تک اسے نظر نہیں آیا جس پر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ دن بہ دن وہ ازمیر سے بیزار ہوتی جا رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے۔ پہلے تو بالکل ٹھیک ہوا کرتا تھا۔" اس شام جب اماں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے حیران ہو رہی تھیں کہ اس نے دو دن سے اپنی شکل نہیں دکھائی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

گزرے چند ماہ میں ازمیر کے رویے میں ایک غیر معمولی تبدیلی آئی تھی اور بحیثیت لڑکی اس کے اندر کا حساس سسٹم چوکنا ہو گیا تھا۔ مگر فطری طور پر وہ صلح جو اور بردبار تھی اس لیے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ کترائی نہ گھبرائی نہ ہی اس سے بھاگنے کی کوشش کی بلکہ اس کی ہر فضول بات کاٹ کر جواب دیا۔ خیال تھا کہ اس طرح وہ سدھر جائے گا' راہ بدل لے گا مگر وہ تو گویا کچھ ٹھان کر ہی بیٹھ گیا تھا۔

وہ پڑھنے کے خیال سے اماں کے پاس سے اٹھ آئی۔ کتابیں کھول کر بیٹھ تو گئی مگر ذہن کچھ اٹک سا گیا تھا۔ ازمیر کے رویے نے اسے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

گو کہ وہ جانتا تھا کہ وہ سجاد سے منسوب ہے اور اس کی منگنی میں خود ازمیر نے دو سال پہلے بڑے ولولے اور جوش کے ساتھ شرکت کی تھی۔ شیما سے زیادہ وہ ایکسائیٹڈ تھا مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ محبت ہمارے ہی اندر کہیں چھپی بیٹھی ہوتی ہے اور اچانک کوئی حادثہ اسے ہم سے متعارف کرا جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ اس روز حسب عادت وہ کرکٹ کھیل کر لوٹا تھا۔ تاہم آج فرق تھا تو بس اتنا کہ وہ بری طرح زخمی تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ اماں نماز میں مصروف تھیں۔ وہ گھر پہنچا تو پتا چلا چچی جان اپنی بہن سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ ناچار ڈریسنگ کرانے ایما کے پاس چلا آیا۔ وہ گرمیوں کی ایک خوشگوار شام تھی۔

اور یہ تو اس کا ہمیشہ کا دستور تھا کہ بنا دستک دیے دھڑلے سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھسا چلا آتا تھا سو اس روز بھی وہ یوں ہی چلا آیا۔ بازو سے بہنے والے خون نے یوں بھی بے حال کر رکھا تھا سوا سے کچھ سوجھا ہی نہیں۔ دھڑ سے دروازہ کھول کر جس لمحے وہ اندر داخل ہوا' ایما کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ غالباً" کچھ ہی دیر پہلے نہا کر نکلی تھی۔ اس کے کمر

UrduPhoto.com

تک لانبے شہد رنگ بال اب تک گیلے تھے جن کی نوکوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

دوپٹے سے بے نیاز سبز رنگ کے لان کے خوبصورت پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس وہ بے حد فریش لگ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا مگر اس سے پہلے کہ ہمیشہ کی طرح وہ ناگواری سے گھور کر اسے دس صلواتیں سناتی اس کے بازو سے بہتے خون نے اس کی توجہ جذب کر لی۔

"ازمیر! یہ کیا ہوا ہے؟" وہ بے اختیارانہ چیخ کر اس کی طرف لپکی تھی۔

"کچھ خاص نہیں۔ میچ سے واپسی پر چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔" ایما کے تشویش زدہ چہرے کو دیکھ کر اس نے قدرے بے نیازی سے بتایا تھا۔

"واٹ۔ یہ چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہے۔ اف میرے خدا۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔" تکلیف کی شدت سے ازمیر کا چہرا پیلا ہو رہا تھا۔ ایما بے ساختہ رو پڑی۔

"ٹیک اٹ ایزی یار! میں ٹھیک ہوں۔ جاؤ جا کر ڈریسنگ کا سامان لے آؤ۔" پہلی بار وہ اس کے لیے یوں تڑپی تھی اور یہ بھی یقیناً" اس سے قبل نہ ہوا تھا کہ ازمیر نے وقت سے ایک لمحہ چرا کر اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا ہو اور اس کا تر و تازہ وجود اپنی آنکھوں میں بسا لیا ہو۔

ذرا دیر بعد وہ بھاگ کر سب سامان لے آئی تھی اور پھر جتنی دیر ڈریسنگ ہوتی رہی وہ بولتی رہی۔

"کتنے لاپروا ہو تم ازمیر! اپنا نہیں تو دوسروں کا ہی خیال کر لیا کرو۔ تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ تمہیں اس طرح زخمی دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی ہے۔ اگر جو چچی جان یا اماں دیکھ لیتیں تو شاید بے ہوش ہی ہو جاتیں۔"

"تم نہیں ہوئیں!" اس نے قدرے مسکرا کر چھیڑا تھا۔ لہجے میں کوئی خاص بات تھی مگر ایما نے خود میں مگن اس بات پر توجہ ہی نہ دی۔

"ہاں ہو جاتی میں بھی۔ پھر یہ ڈریسنگ کرنے کیا مدر ٹریسا آتیں آسمان سے اتر کر۔" ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس نے گھورا تھا اسے۔

"اگر وہ بھی آجاتیں تو آج تمہاری برابری نہیں کر سکتی تھیں۔" وہ ایک جذب سے بولا تھا۔

"بس بس! زیادہ بٹرنگ کی ضرورت نہیں، بے کار ہے۔ میں تو چچی جان سے شکایت ضرور کروں گی تمہاری کہ اس فضول بائیک سے تمہارا پیچھا چھڑائیں، نہیں تو....."

"نہیں تو کیا؟" اس کے ادھورے جملے سے جیسے اس نے لطف لیا تھا۔

"نہیں تو تمہاری اور اپنی جان ایک کر دوں گی۔" کٹ سے قریب ایڈ باکس بند کرتے ہوئے اس نے بے اختیار نظر اٹھائی تھی اور پھر جھٹکے سے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس دوران اس کی گیلی زلفیں نہ جانے کتنی بار ازمیر کے چہرے سے مس ہوئیں۔

"اتنا خیال ہے میرا!" یکدم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے روک لیا تھا۔

"[illegible] اور [illegible] بہنوں کو ہمیشہ اپنے چھوٹوں کا خیال رہتا ہے۔ کچھ آئی سمجھ۔" اس کے بال بگاڑتے ہوئے وہ بردباری سے بولی تو جیسے ازمیر کو کسی نے چھت سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔

جبکہ وہ اس کے احساسات سے بے خبر اطمینان سے واپس لوٹ گئی اور جب کچھ دیر بعد پلٹی تو ہاتھ میں گرم دودھ کا گلاس اور پین کلر کی ایک ٹیبلٹ تھی۔

ازمیر نے پرسوچ اور گہری نظروں سے شاید زندگی میں پہلی بار اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ دھان پان سی پانچ فٹ چار انچ قد والی شہد رنگ بالوں اور شہابی رنگت کی حامل ایک انتہائی دلکش اور تر و تازہ لڑکی تھی جو عمر میں اس سے دس ماہ بڑی ہونے کے باوجود اس کے آگے بالکل نازک سی گڑیا لگتی تھی۔

وہ جو باڈی بلڈنگ اور ویٹ لفٹنگ جیسے شوق پورے کرنے کے بعد یکدم بہت مضبوط جسامت کا مالک بن گیا تھا۔ اپنے چھ فٹ قد کے باعث اس سے

اور بھی بڑا لگتا۔

"تم اب تک کہاں تھیں ایما۔" اس کے نزدیک آنے پر اس نے بے ساختہ کہہ دیا تھا۔ لہجے میں جذب اور گہرائی تھی۔

"کچن میں۔" دوسری طرف فطری سادگی اور بھولپن تھا۔ اس قدر غیر متوقع اور غیر مطلوب جواب ملا تھا کہ ازمیر خیالوں کی دنیا سے ایک جھٹکے سے باہر نکلا۔ نظر اس کے جھکے سر پر جا ٹھہری جو سر جھکائے ٹیبلٹ نکال رہی تھی۔

"اچھا اب یہ لو اور کھا کر فوراً سو جاؤ۔ انشاء اللہ رات تک طبیعت بہتر ہو جائے گی۔ مگر خبردار جو تم نے اگلے دو دن تک کہیں جانے کا سوچا خاص طور پر اس موذی بائیک کی طرف دیکھا بھی تو اسے اٹھا کر کسی اندھے کنویں میں پھنکوا دوں گی۔"

"اور مجھے؟" وہ اس درجے التفات اور لگاوٹ پر کھل سا گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ عمر اور سجاد کے [illegible] خوبصورت [illegible] محسوس ہوئی تھی [illegible] جیسے ساری [illegible] دور ہونے کی امید نے اس امکان نے اسے ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

"اپنی فکر مت کرو۔ تمہیں تو اپنے سامنے اٹھک بیٹھک کراؤں گی۔" وہ غرائی تھی۔

"سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔" جواباً وہ کورنش بجا لایا تھا۔

"کچھ تھا اس کے انداز میں" ایما نے ایک سیکنڈ کے لیے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا تھا اور پھر پلٹ گئی تھی، تاہم اس کے بعد وہ جیسے پھیلتا چلا گیا۔

پہلے پہل محض نظریں قابو سے باہر ہوئیں اور اس کے بعد زبان گوہر افشانیاں کرنے لگی۔ معنی خیز جملوں سے شروع ہو کر اب وہ باقاعدہ دل کا مدعا زبان پر لے آیا تھا۔ یہ الگ بات کہ ایما اسے محض مذاق ہی سمجھتی رہی تھی۔ تاہم جب وہ سنجیدہ ہونے لگا تو پھر وہ بھی پریشان ہو اٹھی۔

اس کا کیا علاج کرے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو پھر نظر انداز کرنے لگتی۔ سجاد سے منسوب ہونے کا ازمیر کو بھی علم تھا۔ وہ کوئی بچہ تو تھا نہیں کہ اسے سمجھایا جاتا یا اپنی اور سجاد کی منگنی کا حوالہ دیا جاتا۔ جب وہ قصداً ایسا کر رہا تھا تو پھر نصیحت کرنے کا فعل بے کار ہی رہتا۔

اگلے ماہ اس کے فائنل ایگزامز تھے۔ پولیٹیکل سائنس میں پرائیویٹ ماسٹرز کرنے کا خیال اسے اسی لیے آیا کہ سجاد کا اگلے دو سال تک شادی نہ کرنے کا ارادہ تھا۔ اس دوران وہ خود کو اسٹیبلش کر لینا چاہتا تھا چونکہ گھر ہی کی بات تھی اس لیے امی پاپا نے اعتراض نہیں کیا تاہم اماں شروع دن سے اتنی لمبی منگنی رکھنے کے خلاف تھیں۔ انہیں سجاد کے تیور کھٹکتے تھے۔

اور یہ ہی تیور دھیرے دھیرے ایما کے دل میں بھی خدشے اور اندیشے پیدا کرنے لگے۔ امی تو حسب عادت مطمئن تھیں اپنی فلاسفی کے تحت مگر اس کا دل اکثر واہموں سے پریشان ہونے لگتا۔ سجاد کو وہ بچپن سے جانتی تھی۔ ہر بار چھٹیوں میں لاہور جانا ہوتا اور خالہ جان کے یہاں ہی ان کا قیام رہتا تھا۔ وہ شروع سے خاموش طبع مگر من مانی کرنے والا تھا۔ عمر کے دو سال کے فرق کے باعث ایما پر خوب رعب جماتا۔

اسکول کے دور تک تو آنا جانا رہا پھر کالج میں آنے کے بعد وہ گھر کی ذمہ داریوں میں بالواسطہ مصروف ہوتی چلی گئی تو پھر ادھر ادھر جانا کم کر دیا۔ پچھلے پانچ سالوں میں اتفاق تھا کہ وہ صرف ایک بار سجاد سے مل سکی تھی۔ وہ بھی منگنی والے دن۔ نہ وہ فون کرتا تھا نہ وش کارڈ یا خط ارسال کرتا۔ سو درمیانی فاصلے حجاب کے باعث اور بھی بڑھ گئے تھے۔

اور یہ فاصلے نہ جانے کیسے ازمیر حماد بھی تاڑ گیا تھا۔ اس لیے اکثر اسے جتا بھی دیتا۔ وہ کیا کہتی کہ اس معاملے میں وہ خود بے بس تھی۔ تاہم اپنے دل کو اس نے ہمیشہ سجاد کی ہمراہی کا خواہشمند پایا تھا۔

اس شام جب وہ پاپا کے کہنے پر ہری مرچ قیمہ بنا رہی تھی شیما نے اندر آتے ہی اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"خیریت؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" اسے یہ بے وقت کا لاڈ سمجھ میں آیا تھا۔

UrduPhoto.com

"الحمد للہ! تاہم اب تمہاری خیریت کو خطرات لاحق ہونے والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"خالہ جان رہی ہیں دو ہفتے بعد۔ لگتا ہے اب کی بار تاریخ پکی کرا کے ہی جائیں گی۔ اف! میں بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی ہوں۔ سچ تمہاری شادی کا ارمان میرے دل میں......"

"بس بس! اب اتنا آگے تک کا نہ سوچو۔" اس نے گہری سانس بھر کر اسے سنجیدگی سے ٹوک دیا تھا۔ یہ خبر گو کہ اعصاب پر خوشگوار تاثر چھوڑ رہی تھی مگر اس منظر سے پرے کہیں کچھ خدشے بھی تھے۔

"کیوں نہ سوچوں۔ سچ میں نے تو اپنے بھانجا بھانجی کے نام تک سوچ لیے ہیں۔" شیما آج غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ اسے دوبارہ ٹوک نہ سکی۔ بے ساختہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئی۔

خالہ جان اس کی متوقع ساس تھیں' اس لیے ان کی آمد کی اطلاع پر گھر میں دوگنا جوش اور معمول سے ہٹ کر تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس شام ازمیر نجانے کیسے راہ بھٹک گیا تھا۔

"عید آنے میں تو ابھی کافی دن ہیں۔ یہ تیاریاں کس خوشی میں ہو رہی ہیں۔" فرنیچر پر وارنش ہوتا دیکھ کر وہ سیدھا اندر چلا آیا تھا۔

"یہ عید کی نہیں کسی کی دید کی خوشی میں ہو رہی ہیں میر بھائی۔" شیما آج کل بہت خوش تھی' اس لیے ازمیر کے احساسات سے قطع نظر شوخی سے بولی تو ازمیر کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"گویا کہ متوقع سسرالی آ رہے ہیں۔"

"بالکل بجا فرمایا۔" ابھی بھی شیما نے جواباً کہا تھا۔

ازمیر نے اسے دیکھا جو سنجیدگی سے کپڑے استری کرتی ان دونوں کی موجودگی اور گفتگو سے لاتعلق نظر آ رہی تھی۔

"کیا امیدوار صاحب بھی آ رہے ہیں۔" قدرے طنز سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ خالہ جان اکیلی تو آنے سے رہیں۔ یوں بھی سجاد بھائی تو یہاں آنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔" شیما نے خیال آرائی کی تھی۔

"ہاں بہانے باز تو خیر وہ ہمیشہ کے ہیں۔" لہجے میں کچھ ایسا تھا ضرور کہ ایما نے بے ساختہ ترچھی نظر اس پر ڈالی تھی جس میں غصہ اور فہمائش دونوں موجود تھے۔

"بائی داوے تم آج یہاں کیسے؟ سنا تھا لوگوں نے تو بائیکاٹ کر رکھا ہے عباد منزل کا۔" اسے کسی طور بدلہ تو چکانا تھا۔ ازمیر کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھلنے لگی۔

"وہ کیا ہے کہ بندہ جان سے تو جا سکتا ہے جان جاں کے کوچے سے نہیں جا سکتا۔ سو کچے دھاگے سے بندھا آیا ہوں۔ تم کہو' اتنی خفگی کس بات پر ہے۔ اتنے دنوں بعد آنے پر یا تمہاری جان نہ کھانے پر۔"

شیما فون کی بیل سن کر باہر چلی گئی تو وہ اپنے ازلی زچ کر دینے کے موڈ میں واپس آ گیا تھا۔

"[illegible] گنتیوں میں [illegible] لگے ہیں ازمیر دن بدن تمہاری لینگویج گھٹیا سے گھٹیا ہوتی جا رہی ہے۔" اسے سخت تاؤ آ گیا تھا۔

"جاہلوں کی محفل سے شرف یاب نہیں ہو سکا' یہ سب اس کا اثر ہے۔ تم کچھ مدد کرو۔"

"اچھا ہوتا کہ میرے ساتھ تم بھی ماسٹرز میں ایڈمیشن لے لیتے شاید سدھرنے کا چانس مل جاتا۔ تعلیم شخصیت کو نکھارتی ہے مگر تم نے تو گریجویشن کر کے گنوایا۔ ابھی بھی وقت ہے' داخلہ لے لو۔"

"معاف رکھو مجھے۔ بمشکل بی ایس سی کلیئر کیا ہے۔ جانتی ہو' دو دو ہزار دے کر ایک ایک پیپر کلیئر کروایا ہے۔ مزید خرچا کرنے کی ہمت نہیں۔" ڈھٹائی عروج پر تھی۔

"کیا فائدہ ایسی ڈگری حاصل کرنے کا جس میں تمہاری محنت شامل نہیں۔" وہ تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"محنت کیوں نہیں۔ ساری بھاگ دوڑ کس نے کی

تھی۔ بندہ ڈھونڈا' اسے خرچا پانی دیا' خرچا پانی کے سارے پیسے میں نے خود ارینج کیے۔ یہ کیا کم محنت ہے۔" وہ ہنوز اسی انداز میں اس کا دل جلا رہا تھا۔ وہ جھلائی۔

"تم سے بات کرنا ہی بے کار ہے۔ خواہ مخواہ سر پتھر سے ٹکرا رہی تھی میں۔" اس کے جھنجلانے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ پھر یکدم چپ ہو کر قدرے اسٹائل سے بولا۔

"ہر پتھر میں ایک دیوتا بستا ہے ایما! تم بھی تراش کر تو دیکھو۔ میں ایک مجسمہ ہوں' پتھر میں سو رہا ہوں۔ کم ان۔ مجھے دریافت کرو۔"

"میں چچا جان سے شکایت کروں گی تمہاری۔ وہ ٹھیک طریقے سے مزاج دریافت کریں گے۔ بتاؤں گی انہیں کہ جسے وہ ہیرا سمجھ رہے ہیں وہ ایک معمولی [illegible] بھی کیا گزرا پتھر ہے۔"

"میں تو صرف پتھر ہوں' وہ تو چٹان سے موٹے کی [illegible] ہو جاؤ گی۔" [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible] ہوئے لہجے میں کہا تو ایما عباد پلکیں جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میر بھائی! اماں بلا رہی ہیں آپ کو۔" آصف نے اسی پل اندر جھانک کر اطلاع دی تھی۔

"آ رہا ہوں۔ تم چلو۔" ایما کی آنکھوں میں ایک ساعت کے لیے رک کر دیکھا تھا پھر آصف کے پیچھے خود بھی کمرے سے نکل گیا اور پیچھے اس کے لیے خیالات کا بھنور چھوڑ گیا جس میں ڈوبتی ابھرتی وہ اس کی باتوں کا پس منظر جانچنے کی کوشش کرتی رہی۔

قطرہ قطرہ پانی کا تالاب بن جاتا ہے۔ ازمیر کی تسلسل سے کی گئی موشگافیاں دھیرے دھیرے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہونے لگی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

خالہ جان کی آمد سے زیادہ اسے سجاد کے حالیہ رویے کے متعلق جاننے کی عجلت تھی۔ اس لیے ذہنی طور پر وہ خاصی اپ سیٹ رہنے لگی تھی۔ ایگزامز کی تیاری بھی ڈھنگ سے نہیں ہو رہی تھی۔ سو اس روز تنگ آ کر اس نے خود کو خاصی جھاڑ پلائی اور صبح جب اماں کو فجر کے بعد ناشتہ دے کر فارغ ہوئی تو کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔

"باادب باملاحظہ ہوشیار' شہنشاہ ازمیر تشریف لاتے ہیں۔" بمشکل آدھا گھنٹہ ہی وہ پڑھ سکی تھی کہ خلاف توقع وہ آدھمکا تھا۔

"میر! تم... خیریت تو ہے اتنی صبح کیسے۔ رات کو سوئے نہیں تھے کیا۔" اس کی حیرت بجا تھی' وہ جو بار بار جگانے کے باوجود نہیں جاگتا تھا' آج صبح صبح یہاں موجود تھا۔

"ہاں۔ ہم پیار میں جلنے والوں کو چین کہاں ہائے آرام کہاں۔ رات بھر اختر شماری اور محلے والوں کی دختر شماری کرتے گزری۔ صبح دم بمشکل آنکھ لگی تھی حالانکہ سرہانے یہ شعر لکھ کر سویا تھا کہ۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

مگر وہ نابنجار ٹائم پیس اردو ادب اور حد ادب دونوں سے ناواقف ہے۔ کسی قرض خواہ کی طرح میرے سر پر چلانے لگا۔ میں سمجھا تم آ گئی ہو۔ جھٹ سے آنکھیں کھول دیں تو معلوم ہوا والدہ گرامی نیم کے درخت اور اس کی افادیت سے متعلق کتاب تھامے کھڑی تھیں اب ان کا آرڈر ہے کہ گلی میں لگے نیم کے درختوں کی علی الصبح خیریت دریافت کی جائے۔ جاگنگ کے لیے بھیجا ہے۔"

اس کے ذرا سے سوال پر طویل و عریض وضاحت سے لبریز جواب موصول ہوا تھا۔ آخر میں جس طرح اس نے منہ بگاڑا تھا ایما کو بے اختیار ہنسی آئی۔ جسے اس نے ہونٹوں تلے دبا لیا تھا۔

"ہوں۔ جب ہی میں کہوں' تم اتنے سحر خیز کب سے ہو گئے۔" اس نے دوبارہ کتاب کھول لی تھی۔

"جب سے جذبے نوخیز اور حالات فکر انگیز ہوئے ہیں۔" ترت جواب آیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے

سے لے کر اب تک صرف اردو کے مضمون پر ہی وہ عبور رکھتا تھا۔

"تمہاری لایعنی گفتگو کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔ جاؤ مجھے پڑھنے دو۔"

"دل سے کہہ رہی ہو؟" وہاں جیسے بے یقینی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"بہت فالتو بولتے ہو ازمیر! تم تو جتنا خاموش رہو اتنا اچھا ہے۔" وہ سخت بیزاری سے گویا ہوئی۔

"مثلاً کتنا بولوں۔ آج اس کا بھی فیصلہ کر ڈالو۔"

"سال میں ایک دفعہ بھی زیادہ ہے۔" اس نے جھلا کر گھورا تھا۔

"یہ تو بڑا مشکل ہے۔ اسی سال میں نے تین مرتبہ قبول ہے کہنے کا ارادہ کیا ہے۔ پلیز فیصلے میں کچھ ترمیم کرو۔" عجیب ڈھیٹ انسان تھا وہ بھی۔

"دفع ہو جاؤ ازمیر یہاں سے۔ جب میں پڑھنے بیٹھتی ہوں۔۔۔۔۔"

"میرا حسین چہرہ تمہاری آنکھوں کے آگے آجاتا ہوگا۔ ورق ورق پر میری آنکھیں جھلملاتی ہوں گی۔ تصور کے پردے پر رنگین آنچل لہراتے ہوں گے۔ ہے ناں؟" بات کاٹ کر وثوق سے پوچھا تھا۔ "ویسے یہ سارے رنگ میرے ہی عطا کردہ ہیں۔" اس کے اشارتاً سے کہنے پر وہ قصداً انجان بن گئی۔

"کیوں! تم نے رنگوں کی دکان کھول لی ہے۔ دوپٹے رنگنے شروع کر دیے ہیں؟"

"تم کہو گی تو یہ کرنے کو بھی تیار ہوں مگر شرط ہے سارے دوپٹے تم خریدو گی۔"

"ہاں ضرور! پھر ان سب کی ایک موٹی سی رسی بنا کر تمہیں اس پنکھے سے لٹکا دوں گی سمجھے۔" اب وہ مشتعل ہو گئی تھی۔ کینہ توز نظروں سے اسے گھور کر بولی تھی۔

"اپنے کمرے میں رکھنے کا اچھا بہانا ہے۔"

"ازمیر! تم قتل ہو جاؤ گے میرے ہاتھوں۔" اب کے وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی تو اس نے ہنستے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

"زہے نصیب۔"

"میں بتاؤں گی چچا جان کو تمہارے سارے کرتوت۔" جھلا کر دھمکی دی۔

"بصد شوق۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ کسی طرح یہ بات کھل جائے۔" جواباً اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا لی تھی۔ جیسے کہیں جانے کا ارادہ نہ ہو۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے۔" وہ تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"دھیرج یار دھیرج۔ چلا جاؤں گا مگر شرط ہے، تمہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔" اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ "کیا خیال ہے مارننگ واک کے لیے ساتھ چلو گی۔" وہ جس کام کے لیے آیا تھا، وہ اب کہا۔

"مارننگ واک؟ تمہارے ساتھ تو جنت میں بھی نہ جاؤں۔" وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"گویا دوزخ میں ساتھ جانے پر اعتراض نہیں ہے۔" وہ ہنسا تھا۔

وہ جھلا کر جیسے روہانسی کی ہو گئی اور پھر وہ یہ جانتی تھی کہ وہ تو جائے گا نہیں اس لیے دھم دھم کرتی خود ہی کمرے سے نکل آئی۔ یہی واحد طریقہ تھا اسے وہاں سے نکال لانے کا اور یہی ہوا۔ وہ اماں کے پاس آکر اس کی شکایت شروع کرنے ہی والی تھی کہ وہ پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔

"اماں! ایما سے کہیں کہ میرے ساتھ صبح سیر کے لیے چلا کرے۔ دیکھیے نا دن بہ دن جل جل کر اس کا رنگ جھلستا جا رہا ہے۔ صبح کی تازہ ہوا جلد کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ میں اسی لیے اسے بلانے آیا تھا۔" اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا تھا۔ اماں نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔

قدرتی بات تھی انہیں بھی اس کے علی الصبح اٹھنے پر حیرت ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد جاگنگ یا مارننگ واک کا شاخسانہ قدرے تحیر سے اسے دیکھا تھا۔

"فار گاڈ سیک اماں! یہ میں ہی ہوں اتنی حیرت سے نہ دیکھیں کہ مجھے اپنی موجودگی پر شبہ ہونے لگے۔" وہ موڑھا گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اماں جھینپ سی گئیں۔

"چل ہٹ۔ زیادہ نہ بولا کر۔"

"ہوں اب تو یہی سوچ رہا ہوں کہ منہ پر ٹیپ لگا لوں۔ گھر پر والدہ محترمہ، یہاں آپ اور آپ کی پوتی صاحب سب کی یہی فرمائش ہے۔" اس نے منہ چلاتے بیٹھی ایما کی طرف اشارہ کیا پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ "یوں بھی جب الفاظ قدر کھو دیں تو خاموشی کو ہی شعار بنا لینا چاہیے۔ سنا ہے خاموش احتجاج زیادہ پر تاثیر ہوتا ہے۔"

لہجہ معنی خیز تھا۔ ایما کا چہرہ سرخ پڑ گیا تو وہاں سے اٹھ گئی۔ اماں نے ایک نظر جاتی ہوئی پوتی کو دیکھا اور پھر دوسری نظر اس پر ڈالی جو یکدم سنجیدہ نظروں سے دور ہوتی ایما کو دیکھ رہا تھا۔

"یا خدایا! میرے معصوم بچوں کو دکھی ہونے سے بچا لے۔" بے ساختہ دل سے دعا نکلی تھی۔

دو دن سے فون ڈیڈ پڑا تھا وہ ازمیر سے کہہ کہہ کر تھک گئی تو خود ہی "حماد منزل" چلی آئی۔ چچی جان حسب عادت باغبانی سے متعلق کوئی کتاب لیے لان میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ سلام دعا کرکے اس نے مدعا عرض کیا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

پھر حسب معمول بات صاف ٹھہرا پڑا تھا۔ چچی جان اس عمر میں بھی بلا کی پھرتیلی تھیں۔ وہ فون پر کمپلین کرکے مڑی تو وہ اندر آچکی تھیں اس نے جانے کا قصد کرنا چاہا تو اشارے سے بٹھا لیا۔

"سنا ہے تمہاری خالہ آرہی ہیں؟" بنا تمہید ہی وہ شروع ہو گئی تھیں۔

"جی!"

"اکیلی آئیں گی؟"

"نہیں۔ شاید سجاد بھی ساتھ ہوں۔" اس نے قیاس آرائی کی تھی۔

"یہاں کیا کوئی اور ملنے والے بھی ہیں ان کے؟" اب کے کچھ کریدنے والے انداز میں انہوں نے پوچھا تھا۔ ایما نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

"پتا نہیں چچی جان! مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔"

"اچھا۔۔۔۔!" وہ قدرے طنز سے مسکرائی تھیں۔ ایما ان کے اس انداز پر ہمیشہ الجھ جاتی تھی اس وقت بھی انگلیاں مسلنے لگی۔ جب ہی وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ "کل میں نے بہادر آباد پر سجاد کو دیکھا ہے دو خواتین بھی ساتھ تھیں اس کے مگر وہ تمہاری خالہ نہیں تھیں۔ وہ غالباً" کراچی میں ہی ہے اس وقت۔۔۔۔" ان کے لہجے میں سرگوشیانہ سا تاثر تھا۔

خبر کچھ ایسی تھی کہ اس کا متحیر اور پریشان ہونا فطری تھا۔

"ممکن ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو چچی جان! کیونکہ۔۔۔۔" بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہوں نے سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا تھا۔

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے لڑکی! وہ سو فیصد سجاد ہی تھا۔ نہ میں چہرے دیکھ کر بھولتی ہوں نہ نام سن کر۔ میری یادداشت ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ دو سال پہلے کا دیکھا چہرہ بھلا دوں۔" ان کا انداز حقیقت سے پر تھا۔

ایما اٹھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں چلتی ہوں۔"

"ہاں ضرور! جاؤ اور اپنی والدہ سے اس بات کا تذکرہ ضرور کرنا تاکہ تمہاری خالہ کے آنے پر بار بار پریں کریں۔" تیکھے لہجے میں انہوں نے باقاعدہ تلقین کی تھی۔

(پتا نہیں کب چچی جان اور امی کے مابین چھڑی یہ غیر اعلانیہ جنگ ختم ہو گی) خیالات اور خدشات سے الجھتی لڑتی وہ بالآخر سارا الزام جٹھانی، دیورانی کی ازلی عداوت کے سر ڈال گئی۔ تاہم دل میں ایک پھانس سی گڑ گئی تھی جسے ایک اور واقعے نے مزید اندر دھنسا دیا۔

دوسرے دن خدا خدا کرکے فون ٹھیک ہوا تو سب

UrduPhoto.com

سے پہلا فون خالہ جان کا ہی آیا۔ اسی نے ریسیو کیا تھا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے کہا۔

”بیٹا ایما! میں اس ہفتے کراچی نہیں آسکتی۔ دراصل سجاد آج کل آفس کے کسی کام سے پنڈی گیا ہوا ہے۔ انشاء اللہ جوں ہی آیا‘ میں کراچی کے ٹکٹ لے لوں گی۔“

”مگر ابھی ڈیڑھ ہفتے پہلے تک تو سجاد کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا‘ خالہ جان!“

”ہاں بیٹا! بس اس کے موڈ اور پروگراموں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کب بدل جائے۔ بہت ہی غیر مستقل مزاج لڑکا ہے۔“ بظاہر تو وہ بشاشت سے کہہ رہی تھیں مگر ایما کے حساس دل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پریشان ہیں۔ سو فوراً اظہار بھی کر دیا۔

”آپ پریشان لگ رہی ہیں خالہ جان! خیریت تو ہے‘ کیا بات ہے؟“

”ارے نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ تم دل میں وہم مت لاؤ۔ میں انشاء اللہ جلد آؤں گی۔ اصل میں اکلوتی اولاد ہے‘ اس لیے نخرے اٹھا اٹھا کر میں نے ہی اسے ہٹ دھرم اور ضدی بنا دیا ہے۔ بس ایک بار جو کہہ دے‘ وہ پتھر پر لکیر ہو جاتا ہے۔ پنڈی جانے کا ارادہ تھا سو چلا گیا ہے۔ پر تم فکر مت کرنا‘ آئے گا تو اچھی طرح کان کھینچوں گی۔“

وہ پھر ہنسی تھیں مگر وہ دل سے نکلی اور بناوٹی ہنسی کے فرق کو سمجھ سکتی تھی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بمشکل خود کو کچھ اور کہنے سے روکا۔ اسی دوران امی وہاں آگئی تھیں۔ اس نے ریسیور انہیں پکڑایا اور خاموشی سے لان میں چلی آئی۔ دوپہر کی زرد اور کمزور دھوپ کی کرنیں سامنے لان چیئر پر بیٹھے پاپا کے سنہری فریم والے گلاسز کو خوب چمکا رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس ہی آبیٹھی۔ دھیان بٹانے کے لیے ضروری تھا۔

”خیریت تو ہے۔ کچھ پریشان ہو بیٹا۔“

”نہیں تو پاپا۔“ یکدم اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کوئی خاص خبر۔“ پاپا تو جیسے اس کی آنکھوں میں اترے خدشوں کے سائے دیکھ رہے تھے۔

”ہاں خالہ جان نہیں آرہیں۔“ گہری سانس بھر کر کہتے ہوئے اس نے ساری بات کہہ سنائی۔ ساتھ ہی کل چچی جان کی مصدقہ خبر بھی ان تک پہنچا دی۔

”یہ کیسے ممکن ہے پاپا کہ ایک شخص بیک وقت دو شہروں میں موجود ہو۔ اب یا تو چچی جان غلط بیانی کر رہی ہیں یا پھر خالہ جان۔“ وہ زیادہ دیر پاپا سے چھپ نہیں سکتی تھی‘ عیاں ہو گئی۔

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ پاپا لب بھینچے کچھ دیر سوچتے رہے پھر کھنکھار کر بولے تو لہجہ مضبوط تھا۔

”غلط بیانی کوئی بھی کر رہا ہو بیٹا! ہم تمہارے حق میں تمہاری رضا سے کوئی غلط فیصلہ انشاء اللہ نہیں ہونے دیں گے۔ کبھی کبھار جذباتیت سے قطع نظر استدلال کا ساتھ دینا پڑتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایما عباد اپنے پاپا کے فیصلے کا بھرم ضرور رکھے گی۔“

اس کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے انہوں نے جیسے اس کی ساری پریشانیاں جذب کر لی تھیں۔ اس نے آنکھیں موند کر خود کو ایک بار پھر ٹٹولا۔ اندر دور تک گہرا سکوت طاری تھا۔ دو سال کے طویل عرصے میں سجاد کی شبیہہ اس کے دل کے فریم میں جڑ چکی تھی مگر اس نے پاپا کا ساتھ دینے کا عہد کر لیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

”سنو! آج رات یاور کی طرف باربی کیو کا پروگرام ہے‘ چلو گی؟“ دوپہر میں وہ اماں کے سر میں تیل لگا کر فارغ ہوئی تو کمر سیدھی کرنے کا ارادہ تھا جب ہی ازمیر ناگہانی آفت کی طرح ٹپکا تھا۔

”معاف رکھو مجھے‘ اتنی سردی میں‘ میں تو نہیں جا رہی۔ اور تم لوگوں کا کیا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یقیناً ”اوپن ایئر“ میں ارینج کیا ہو گا؟“ وہ ہاتھ دھو کر پلٹتے ہوئے سنجیدہ تھی۔

”سو تو ہے۔“ اس نے تصدیق کی۔

”سدھر جاؤ ازمیر! اس موسم میں تمہیں سیر سپاٹے سوجھ رہے ہیں جبکہ موسمی بیماریاں عروج پر ہیں۔“

”وہ ساری موسمی بیماریاں کیا ہمارے گیٹ ٹو گیدر کی پیداوار ہیں جو تم مجھے سنا رہی ہو۔ تمہیں چلنے کی آفر

کر رہا تھا اس کا جواب دو‘ لیکچر نہیں چاہیے۔“ بیزاری سے ہاتھ اٹھا کر اس نے دو ٹوک کہا۔

”دے تو دیا ہے جواب۔ مجھے نہیں چلنا تمہارے ساتھ۔“ اس نے کورا جواب دے دیا۔

”چل کر تو دیکھو‘ سارے راستے کہکشاں سے سجے ہوئے ملیں گے میری ہم سفری میں۔“ وہ شوخی اور ذو معنویت سے بولا تو وہ بھنا گئی۔

”باز آئی میں تمہاری ہم سفری سے۔ خود تو بھٹکے ہوئے ہو ہی مجھے بھی راستہ بھلا دو گے۔“ وہ صاف گوئی سے انکار کر گئی تھی۔ ازمیر یوں ہی ہنس پڑا۔

”تم جسے راستہ سمجھ رہی ہو‘ وہ بند گلی ہے مائی ڈیئر! جس کے ڈیڈ اینڈ پر بڑا سا بورڈ تمہارا منہ چڑا رہا ہے جس پر لکھے ”نارسائی“ کے حروف تمہیں بہت ہرٹ کریں گے۔ اس وقت میں تمہیں یاد آؤں گا۔“ گہری نظریں اس پر جمائے سنجیدگی سے مستقبل کا نقشہ کھینچا۔ مگر یہاں کسے پروا تھی۔

”دیکھیں گے‘ دیکھیں گے۔ فی الحال تو مجھے آرام کرنے دو‘ ڈسٹرب مت کرو۔“

UrduPhoto.com

”ڈسٹرب تو میں تمہیں کر ہی چکا ہوں۔ اقرار نہ کرو یہ الگ بات ہے۔“ اسے گلابی کمبل میں چھپتے دیکھ کر اس نے یہ فقرہ اچھالا تھا۔ پھر کوئی جواب نہ پا کر خود ہی ہنستا ہوا ”تیار رہنا“ کا ہدایتی جملہ پھینک کر یہ دیکھے بغیر چلا گیا کہ ایما عباد کی پلکیں پھر دوبارہ ایک دوسرے سے نہ جڑ سکی تھیں۔ چھت کو گھورتے ہوئے وہ سوچے چلے جا رہی تھی۔ سوچ کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو کڑی در کڑی جڑتے جڑتے بالآخر ازمیر پر آکر رکا تو اس نے چونک کر پلکیں موند لیں۔

شام کو وہ قطعاً ”کہیں جانے کے موڈ میں نہ تھی مگر ازمیر نے آکر پاپا اور اماں کو نہ جانے کس طرح کنوینس کیا تھا کہ وہ اسے اس کے ساتھ بھیجنے پر راضی ہو گئے تھے۔ ورنہ رات کی پارٹیاں اٹینڈ کرنے کی اماں سخت خلاف تھیں۔ ناچار اسے تیار ہونا پڑا۔ شیما کو ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

”سوری! آج صبا پورے دو ماہ بعد کراچی واپس آرہی ہے۔ میں اس سے ملنے جاؤں گی امی کے ساتھ۔“ اس نے اپنی بیسٹ فرینڈ کا حوالہ دیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

حسب ہدایت وہ رات آٹھ بجے چچا جان کی آلٹو لیے گیٹ پر ہارن بجا رہا تھا۔ جب شنوائی نہ ہوئی تو خود اندر چلا آیا جہاں وہ لائٹ میک اپ کر کے دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی۔

کیمل براؤن جرسی ویلوٹ کے سوٹ پر نیٹ کا دوپٹہ جس پر جابجا گولڈن نگ جڑے ہوئے تھے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔ اس پر نازک نگوں والی بالیاں پہنے وہ ازمیر کی ساری توجہ سارا ارتکاز جذب کر گئی۔

”ہیلو.... ہیلو۔ کیا مسمرائز ہو گئے ہیں میر بھائی۔“ شیما اس کے لیے گولڈن کورٹ شوز اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے کھڑے ازمیر کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔ ایما نے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔

دیر سے پلکیں نہیں جھپکیں میری
پیش جاں اب کے نظارہ اور ہے

اس کے نظر اٹھانے پر وہ بے ساختہ کہہ گیا تھا۔ ایما کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ کبھی کبھی وہ بالکل ہی آؤٹ ہو جاتا تھا۔ جھلا کر وہ اسے گھورنے لگی۔

”دیکھو ازمیر! اگر تم نے اس طرح فضول باتیں کیں تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

”کمال ہے یار! لڑکیاں تو اپنی تعریفیں سننے کے لیے مرتی ہیں۔ یہ تمہاری بہن کس سیارے سے آئی مخلوق ہے۔“ وہ کمال سادگی سے شیما کی طرف رخ پھیرتے ہوئے دریافت کر رہا تھا۔

”پتا نہیں! ابھی تحقیق جاری ہے۔“ شیما کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

”چلو خیر! لیکن جب پتا چل جائے تو مجھے ضرور بتانا۔“ وہ تاکید کر رہا تھا۔

”سدھر جاؤ تم دونوں۔ نہیں تو بہت برا ہو گا۔“ وہ دونوں کو خون آشام نظروں سے گھورتی وارننگ دے

رہی تھی۔ ازمیر کھل کے ہنس دیا جبکہ شیما نے بھاگ لینے میں عافیت جانی تھی۔

"مزید برا کیا ہو گا ڈیئر! جو کچھ ہو چکا ہے' کیا اسے اچھا سمجھا جا سکتا ہے؟ اینی وے اس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کریں گے' فی الحال تو چلو۔" گہری نظروں سے اسے دیکھتا وہ اپنی دھن میں بول رہا تھا۔ پھر اچانک وقت کا خیال آیا تو لہجہ بدل لیا۔ ایما اسے خشمگیں نظروں سے گھورتی باہر نکل آئی' وہ بھی ساتھ تھا۔ سرگوشیانہ لہجے میں دوستانہ پن سے بولا۔

"دن بہ دن تمہاری ساری عادتیں بالکل میری ہونے والی بیوی سے ملنے لگی ہیں۔"

بات ہی ایسی تھی اس نے چڑ کر اپنا شولڈر بیگ اس کے کندھے پر دے مارا جو اس وقت بلیک ٹی شرٹ اور بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ براؤنش بلیک کوٹ میں عام دنوں کے مقابلے میں بے حد اسمارٹ اور ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ آج بطور خاص خود پر توجہ دی تھی۔ اسے چوٹ کہاں لگتی ڈھٹائی سے ہنستا ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔

کراچی کلب کے لان میں اچھا خاصا گیٹ ٹو گیدر تھا۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے ڈنر سرو ہونے کی تیاریاں تھیں۔ ازمیر اسے ڈھیروں لوگوں سے متعارف کراتا رہا اور سب نے اسے یوں توصیفی نظروں سے دیکھا جیسے ازمیر کی چوائس کی داد دے رہے ہوں۔ جلال اور طیش کی لہریں اس کے اندر بری طرح موجزن ہوئی تھیں جس کا اظہار اس کی چنگاریاں اگلتی آنکھوں سے ضرور ہو رہا تھا جسے قصداً" نظر انداز کیے ازمیر کی شوخیاں' شرارتیں اور معنی خیزیاں عروج پر تھیں۔

برداشت کی آخری حد تک تو اس نے ضبط کیا تھا۔ پھر ازمیر کے پاس سے ہٹ آئی۔ ڈنر سرو ہو گیا۔ تو ازمیر بھی چلا آیا تھا۔ "دکنی کباب" پلیٹ میں نکالتے ہوئے اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ مزے سے بولا۔

"میرے پورے سرکل کو تم بہت پسند آئی ہو۔ اور کیوں نہ ہو آخر کو چوائس کس کی ہے۔"

"ازمیر! جسٹ اسٹاپ دس نان سینس۔ تمہیں ذرا بھی احساس ہے کہ تم کسی کی منگیتر کو کس طرح اپنے سرکل میں انٹروڈیوس کرا رہے ہو۔" اس کا پارہ بری طرح چڑھا تھا۔ جواباً" ازمیر کی بھنویں سکڑ گئیں۔

"دیٹس میری چوائس ہو ایما! خواہ تمہاری منگنی کسی سے بھی ہو گئی ہو۔ دیٹ ڈزنٹ بودر (That doesn't bother)۔" لہجہ سنجیدہ اور چہرے پر یکدم سختی ابھر آئی تھی۔ ایما پلکیں جھپک کر رہ گئی اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے بے پناہ غصہ آیا تھا۔ سو الگ آ کر بیٹھ گئی۔ وہاں زیادہ تر لڑکے تھے یا پھر ان کی منگیتر یا بیویاں جو کہ اپنے اپنے منگیتروں اور شوہروں کے پہلو سے لگی کھڑی تھیں۔ اس نے بیزار ہو کر ادھر ادھر نظریں دوڑانی شروع کر دی تھیں کہ اچانک نگاہ جیسے ایک منظر میں جکڑ کر رہ گئی۔ وہ یقیناً" سجاد ہی تھا جس کے بائیں شانے سے لگی کھڑی وہ طرحدار اور الٹرا ماڈرن لڑکی بھرپور استحقاق کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

ایک بار' دو بار' تین بار اس نے آنکھیں بند کر کے کھولی تھیں مگر سین بدلا تھا نہ اس کے کردار۔ کلب کی اندرونی بلڈنگ کی طرف جاتی خوبصورت ماربل کی سیڑھیوں پر وہ دونوں کھڑے تھے' ساتھ ہی قدرے فاصلے سے کھڑی قدرے ادھیڑ عمر عورت اپنے اسٹیٹس کی نمائش کی خاطر غیر ضروری سنگھار سے آراستہ تکلف اور بناوٹ سے ہاتھ چلا چلا کر بول رہی تھی۔

اسے چچی جان کے الفاظ یاد آئے تو آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی اور پھر اس کی مسلسل نگاہوں کا ارتکاز تھا کہ اچانک سجاد نے گردن کو قدرے خم دے کر دائیں جانب دیکھا تو بے اختیار جھٹکا کھایا۔ یقیناً" وہ اس وقت اس کی یہاں موجودگی کا یقین نہیں کر پا رہا تھا جو دور بیٹھی انتہائی حیرت' تاسف اور غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً" وہ اگلے لمحے بے حد بوکھلاہٹ میں ان دونوں خواتین کو لے کر وہاں سے بعجلت چلا گیا تھا۔

اور اس کا اس طرح بھاگنا ہی اس کے دل کا چور

UrduPhoto.com

واضح کر گیا۔ اس نے دھیرے سے ساکت پلکوں کو جنبش دی تو نمی کی موجودگی نے دل کی آنچ کو کچھ اور بڑھا دیا۔ اسی لمحے ذرا فاصلے پر کھڑے ازمیر نے بھی سب دیکھا تھا۔ اس لیے بے اختیار اس کی طرف لپک کر آیا تھا۔

"ایما! تم ٹھیک تو ہو؟" اس کے لہجے میں تردد اور بے حد اپنائیت تھی۔

"پلیز ازمیر! مجھے واپس لے چلو۔ مجھے واپس جانا ہے۔" ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے خود پر بہت ضبط کیا تھا۔ ازمیر کے چہرے پر اس کے لیے ہمدردانہ تاثرات ابھر آئے تھے۔

"ٹھیک ہے چلو۔ یوں بھی ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی کہ واپسی کا راستہ ملنا مشکل ہو جائے۔" سنجیدگی اور بردباری سے کہتا وہ دوستوں سے معذرت کرنے چلا گیا تو وہ اس کے انداز پر گہرائی سے سوچتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھر آیئے گا ایما! ہمیں خوشی ہو گی۔" ازمیر کے قریبی دوست چلے آئے تھے۔

"اب آپ آیئے گا' میں تو آ گئی۔" اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"آف کورس' ہم تو آئیں گے۔ ازمیر نے جلد ہی ہمیں گرینڈ پارٹی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ غالباً" اسے دعوت ولیمہ کہتے ہیں۔" وہ سب مل کر بول رہے تھے۔ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ ازمیر بھی ان سب کی اس بے وقت کی راگنی پر انہیں گھورتا اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ تم ان کی باتوں کا برا مت ماننا ایما! ان فیکٹ یہ سب بس ایسے ہی ہیں۔" کار ریورس کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ ازمیر یکدم سنجیدہ ہو گیا پھر قدرے توقف کے بعد بولا تو لفظ لفظ تلا ہوا تھا۔

"قصور تمہارا نہیں، والدین کے فیصلے کو تم نے تابعداری سے نبھایا ہے ایما! مگر جب سامنے والا فریق وفا کے انمول خزانے کو ٹھوکر مار کر چلا جائے تو اس کی یاد میں آنسو نہیں بہائے جاتے۔ جو تم نے آج دیکھا میں وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے جانتا ہوں اور اس حقیقت کا ادراک تمہاری خالہ جان کو بھی ہے۔ مگر وہ بیٹے کی ضد اور بہن کی محبت سے مجبور ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم تایا جان اور تائی جان کے فیصلے سے منہ موڑ لو لیکن اتنا ضرور مشورہ دوں گا کہ آزمائے ہوئے کو آزمانا بے وقوفی ہے جو آج تمہیں دھوکا دے رہا ہے، آگے بھی یہی کرے گا۔"

ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ خاموش ہو گیا تھا مگر ساکت بیٹھی ایما میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ گھر آگیا۔ اسے عباد منزل کے گیٹ پر اتارنے کے لیے کار روک کر اس نے بے اختیار کہا تھا۔

"ہم اچھے دوست ہیں ایما! رونا چاہو تو کندھا حاضر ہے۔ مگر تم رونا مت۔ اتنا ارزاں وجود نہیں ہے تمہارا۔" آنکھوں میں محبت اور اپنائیت کی الوہی شمعیں جلائے وہ تاکید کر رہا تھا۔ ایما نے گہری سانس بھرتے ہوئے فرنٹ ڈور کھولا اور خاموشی سے اتر کر اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

امی اور شیما صبا کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ اماں دس بجے کے بعد سو جاتی تھیں۔ وہ گھر اور دل میں بولتے سناٹے سے گھبرا کر لاؤنج میں ہی آبیٹھی۔ ازمیر کی درخواست اور ضبط کے باوجود اس کے رخسار بھیگنے لگے تھے۔ اتفاقاً اسی اثنا میں پاپا کمرے سے نکلے تو اسے اس حال میں دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف بڑھتے چلے آئے۔

"ایما بیٹا! کیا ہوا؟" ان کے لہجے میں گھبراہٹ تھی جس سے اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ کتنے ہی لمحے اسے خود پر قابو پانے میں لگے اور جب آنسو تھم گئے تو اس نے سب کہہ سنایا۔

"چچی جان ٹھیک تھیں پاپا! سجاد بھیں کراچی میں ہیں۔" یہ خبر کسی دھچکے کی طرح عباد صاحب کے دل پر لگی تھی۔ بے اختیار بیٹی کا سر سینے سے لگا لیا۔

"میں اپنے شریک حیات کی ہر برائی برداشت کر سکتی ہوں پاپا! اس سے نباہ کر سکتی ہوں سوائے فراڈ اور چیٹنگ کے۔ سو پلیز یہ انگیجمنٹ رنگ خالہ جان کو واپس کر دیجیے گا۔ مجھے یقین ہے آپ میرے فیصلے کا مان رکھیں گے۔" خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے دل کو پارہ پارہ ہوتے محسوس کیا تھا مگر انگوٹھی اتارنے میں پس و پیش نہیں کی کہ اب فیصلہ ہو چکا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اس کے فیصلے کی خبر جنگل کی آگ نہیں تھی مگر پھر بھی صبح تک سارے گھر میں پھیل چکی تھی۔ اماں، امی اور شیما سب ہی ناشتے کے لیے حاضر تھے سو ناشتے کی ٹیبل کے گرد ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے ایک ایک بات تفصیلاً بتا دی۔ لمحے بھر کے لیے جیسے سکوت سا چھا گیا تھا جسے امی نے کرسی دھکیلتے ہوئے توڑا۔

"تم سب ناشتہ کرو، میں آتی ہوں۔" ان کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔

اور پھر چند لمحوں بعد ان کی خاصی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ فون پر یقیناً وہ خالہ سے بات کر رہی تھیں۔ پھر کتنے ہی پل ایسے ہی گزر گئے۔ امی واپس لوٹیں تو نسبتاً پرسکون تھیں۔

"سجاد کا ذکر اب اس گھر میں کبھی نہیں ہوگا۔ دیٹس آل۔" ہاتھ اٹھا کر انہوں نے فیصلہ سنا دیا تھا اور پھر چائے کا کپ اٹھا کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں جس کے باعث بقیہ حاضرین بھی سستی سے لقمے زہر مار کرنے لگے۔

کہنے کو تو امی نے خالہ جان سے بہت کچھ کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لی تھی مگر اس طرح رشتہ ٹوٹ جانے کا دکھ ان کی آنکھوں میں تحریر تھا۔ وہ پریشان سی ہو کر ان کے پاس چلی آئی۔

"میری بیٹی تو ہیرا ہے۔ وہ ہی ناعاقبت اندیش تھے۔ بہرحال تم بالکل دکھ مت کرنا۔ ہاں۔" اسے گلے سے لگاتے ہوئے وہ اس سے زیادہ شاید خود کو تسلی دے رہی تھیں۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں امی! آپ ہرٹ مت ہوں۔ یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں۔" اس نے الگ ہوتے ہوئے انہیں اطمینان دلانے کی سعی کی تو وہ مسکرا دیں۔

یہ وہ ہی امی تھیں جو فلسفہ خود مختاری کی زبردستی حامی تھیں مگر سجاد کے اس دھوکے نے انہیں سخت رنج پہنچایا تھا۔ انہیں دکھ محض منگنی ٹوٹنے کا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں خالہ جان کی پہلو تہی کرنے، اپنے بھروسے کے ٹوٹنے اور اپنے فلسفے سے پیچھے ہٹ جانے کا بھی افسوس تھا جب ہی وہ کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ جب وہ باہر آئیں گی تو پہلے کی طرح بالکل نارمل ہوں گی، اس لیے ان کے باہر آنے سے پہلے اسے خود کو بالکل نارمل بنانا تھا۔ سنبھالنا تھا۔ شیما اس کے دکھ پر بہت افسردہ تھی۔ جس وقت وہ اپنے کمرے سے [illegible] اسے ہاتھ [illegible] دیکھ کر [illegible] کے پاس چلی آئی۔

"خیریت! تم ایسے کیوں بیٹھی ہو۔ کالج نہیں جانا کیا؟"

"نہیں۔ میں آج تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"تکلف مت۔ میں کوئی بیمار ہوں جو تیمارداری کرو گی میری۔ چلو اٹھو جاؤ فٹافٹ، کالج سے غائب ہونے کا اچھا بہانا ملا ہے تمہیں۔" وہ بالکل روزمرہ کی طرح بات کر رہی تھی۔ شیما نے نظر اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔

"ایما! تمہیں بہت دکھ ہوا ہوگا ناں۔" وہ بڑی ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔ ایما سنجیدہ ہو گئی۔

"نہیں۔ جو لوگ چیٹنگ کرتے ہیں ان کے لیے میرے دل میں کوئی جذبہ باقی نہیں رہتا نہ محبت کا نہ نفرت کا، نہ دکھ کا نہ خوشی کا۔ ایسے لوگ اس لائق نہیں ہوتے کہ ان کے لیے کڑھا جائے۔" اس کا لہجہ قطعیت سے بھرپور تھا۔ شیما جیسے پرسکون ہو کر مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک کہا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے وہ خوش نظر آ رہی تھی۔

"اچھا بس اب چلنے کی کرو۔ تمہاری وین تو حسب معمول نکل چکی ہوگی۔ میں ازمیر کو بلوا دیتی ہوں۔ تم تیار ہو جاؤ۔" اسے ہدایتیں دے کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ ازمیر کو بلوا کر اخبار پڑھنے بیٹھ گئی۔

اور شاید یہ سارا احوال شیما نے راستے میں ہی ازمیر کے گوش گزار کر دیا تھا جب ہی وہ اسے ڈراپ کر کے واپس پلٹا تو سیدھا اس کے کمرے میں گھسا چلا آیا تھا۔

"ہیلو۔" داخل ہوتے ہی باآواز بلند کہا تو اس نے اخبار سے سر اٹھا کر اسے گھورا۔

"صبح بخیر۔ خیریت یہاں کیوں آئے ہو۔"

"پرسہ دینے۔" ترت کہتا وہ سامنے آبیٹھا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکا گئی تو وہ بے اختیار سنجیدہ ہو گیا۔

"اداس ہو؟" تردد اور فکر مندی سے سوال کیا تھا۔ وہ تلملا گئی۔

"جی نہیں۔ اتنا فضول وقت نہیں ہے میرے پاس۔" جانتی تھی اسے بھنک بھی پڑ گئی تو سر چڑھ جائے گا۔

"سچ کہہ رہی ہو۔" وہ اب بھی بے یقین تھا۔

"ظاہر ہے، تمہاری طرح منافق نہیں ہوں میں۔" قصداً آنکھیں نکالیں تو وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

"چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔"

"احسان ہے تمہارا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

"جاؤں گا تو ضرور مگر اب کی بار آیا تو تمہیں ساتھ لے کر ضرور جاؤں گا۔ آخر کو میری راہ کا آخری کانٹا بھی نکل چکا ہے۔" حسب دستور وہ ذرا ہی دیر میں اپنی جون میں واپس آچکا تھا۔

وہ جھلا کر پیر پٹختی باہر نکل آئی اور وہ اماں کے پاس جا بیٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اماں سے کیا کہہ رہا ہوگا اس لیے خاموشی سے کچن میں چلی آئی اور کتنی ہی دیر یہ سوچتی رہی کہ اسے یہاں کیا کام تھا۔ بالآخر گہری

سانس بھر کر فریج کھول لیا۔ وہ پھر کے کھانے کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ خود کو بہلانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اے نئے دوست میں سمجھوں گا تجھے بھی اپنا
پہلے ماضی کا کوئی زخم تو بھر جانے دے

ازمیر کا اب زیادہ تر وقت ادھر ہی گزرنے لگا تھا۔ کبھی شوخی تو کبھی سنجیدگی سے وہ دھیرے دھیرے اسے سجاد والے واقعے کے خول سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تاہم اب اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ ازمیر کی خواہش پر سر جھکا دے۔ آخر کار وہ جھلا ہی گیا ایک دن۔

"آخر تمہیں انکار کیوں ہے؟"

"تمہیں اصرار کیوں ہے؟" ادھر سے بھی اسی لہجے میں سوال ہوا تھا۔

"اس لیے کہ تم میری پسند ہو۔ تمہیں کیوں انکار ہے؟"

"کیونکہ تم مجھے اس لحاظ سے بالکل بھی پسند نہیں۔" اس نے دو ٹوک جواب دے دیا تھا۔ مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دوسرے دن چچا جان کا آنا اور چچی جان کا ان کے ساتھ نہ آنا اسے ٹھٹکا گیا۔ حسب توقع وہ ازمیر کا رشتہ لائے تھے۔

اماں نے اسے خبر دینے کے ساتھ ساتھ ڈھیروں مثالوں اور دلیلوں سے کنوینس کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر اس کے دل میں گنجائش نہ بن سکی۔ انکار اپنی جگہ مسلم تھا۔

اور شاید وہ اپنے اس انکار پر قائم بھی رہتی مگر بابا نے اس سے بنا پوچھے چچا جان کو ہاں کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ چند مہینوں کے معمولی فرق کو درمیان میں لا کر اتنا اچھا رشتہ نہیں گنوا سکتے۔ اس نے سنا تو ششدر رہ گئی۔ امید سے امی کی طرف دیکھا مگر وہ کئی دن بعد قدرے مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ گھبرا کر اس نے تیما کے بازوؤں میں پناہ لی۔

"بے وقوف ہو تم۔ ازمیر بھائی اتنے اچھے ہیں اور سب سے بڑھ کر تمہیں کتنا پسند کرتے ہیں۔ ذرا سوچو، سجاد بھائی کے یہاں نہ عمر کا فرق تھا نہ خالہ کی ناپسندیدگی پھر بھی تمہارے لیے ان کے ساتھ خوش رہنے کے چانسز صفر تھے جبکہ یہاں چچی جان کا مزاج کڑوا ضرور ہے مگر اس میں زیادہ ہاتھ امی کا ہے۔ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو گا، تم خدمت سے انہیں جیت سکتی ہو۔ پھر یہ دیکھو کہ ازمیر بھائی اب چچا جان کے ریٹائر ہونے کے بعد اگلے ماہ کے ڈی اے میں ایک اچھی پوسٹ پر اپائنٹ ہونے والے ہیں گویا مادی، ذہنی، قلبی اور معاشرتی ہر طرح سے تمہیں یہاں خوشی اور سکون مل سکتا ہے۔ خاص طور پر محبت جیسی عنقا دولت بھی۔"

تیما کا فل ووٹ ازمیر کی طرف تھا۔ وہ محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا ہر لفظ ترازو میں تلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے بے اختیار گزرے دنوں کا اک اک لمحہ یاد آیا ازمیر نے جب اس سے اظہار مدعا کیا، اسے سپورٹ کیا، اسے سمجھایا، اسے زندگی اور زندہ دلی کا مطلب سمجھایا، اسے اپنی زندگی اور ذہن سے نکال پھینکنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

"بیٹا! مجھے یقین ہے، تم میرے فیصلے کا ویسے ہی مان رکھو گی جیسے میں نے رکھا تھا۔" بابا نے کچھ دن تک تو اسے ادھیڑ بن میں الجھا دیکھا پھر ایک دن پاس بلا کر شفقت سے بولے تو اس کے پاس وضاحتیں دینے اور انکار کرنے کو کچھ نہ بچا۔ کوئی تاویل کوئی دلیل دینا اب بے کار تھا۔

بے اختیار سر ہلاتے ہوئے اس نے مسکرا کر ان کے بازوؤں میں سر چھپا لیا تھا۔ اس کے اور بابا کے درمیان ایک ان کہا معاہدہ طے تھا کہ کبھی ایک دوسرے کے فیصلے کو رد نہیں کرنا سو اس نے ایسا ہی کیا۔

چنانچہ اماں نے چچی جان کو بلوا بھیجا جنہیں ازمیر اور چچا جان نے جس طرح راضی کیا تھا، وہ ان کے چہرے سے ظاہر تھا، تاہم رشتہ طے کرنے کے ساتھ

ساتھ اماں نے عید کے چاند دونوں کا نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو دونوں جانب سے ہامی بھر لی گئی۔

ازمیر کی خوشی تو دیدنی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ اماں سے نظر بچائے اس کے سر پر سوار ادھر ادھر کی فضول ہانکتا رہا حتیٰ کہ اماں کو دھیان آ ہی گیا۔

"توبہ یہ اماں بھی ایک دن ظالم سماج کا رول پلے کریں گی، مجھے اندازہ نہ تھا۔" وہ اچک کر ٹیبل سے اترتے ہوئے بڑے درد سے بولا تھا۔

"ابھی تو آپ کو چچی جان کا محاذ کشمیر بھی فتح کرنا ہے۔" تیما نے ہنستے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"ہائے ہائے۔ ایک میں اور ایک میری جان ناتواں۔ کون کون سے محاذ سر کروں۔ ابھی تمہاری الجبرا کی انسانی شکل جیسی بہن کو منایا ہے تو ادھر اور بھی دکھ پڑے ہیں۔" اس نے ایک سرد طویل آہ کھینچی تھی۔

"ہاں تو کس نے کہا تھا، عشق کے عذابوں میں پڑنے کے لیے۔ بقول شاعر۔

زندگی کانٹوں پہ ان کی کٹتی ہے
پھول رکھتے ہیں جو کتابوں میں

ایما نے سیدھے سادے لہجے میں باقاعدہ ٹوک دیا تھا۔

"ارے ارے ارے، یہ انداز۔ دیکھو لڑکی حد میں رہو۔ اب ہمارا رشتہ بدلنے والا ہے۔ حد ادب کی پاسداری واجب ہے بلکہ فرض ہے تم پر۔" وہ بدکا تھا۔

"منہ دھو رکھو۔ تمہارے ساتھ تو اب اسی ٹون میں گفتگو ہوا کرے گی۔" وہ تو باقاعدہ لڑنے مرنے پر تل گئی تھی۔

"کیا... کیا... یہ انداز۔" وہ بھی لڑنے کے لیے کمر کس کر میدان میں اتر آیا تھا۔ تیما نے پہلے تو دونوں کو روکنے کی کوشش کی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو سر پیٹتی باہر نکل آئی۔

"اے ہے۔ یہ دونوں کو کیا ہو گیا۔ کیوں لڑ رہے ہیں؟" اماں نے باہر آتی تیما سے گھبراہٹ آمیز لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ قدرے مسکرا کر ان کے برابر ہی ٹک گئی۔

"اب اس قسم کی دھما کہ دار لڑائیوں کی عادت ڈال لیں اماں! پانی پت کی دوسری تیسری بلکہ ہزارویں لڑائی اب اسی گھر میں لڑی جائے گی۔" اس کے انداز میں سراسر شرارت تھی۔ اماں کے ضعیف چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ماشاء اللہ، اللہ جیتا رکھے۔ ارے میاں بیوی کی لڑائی تو محبت کی شروعات ہوتی ہے۔" وہ دل سے خوش نظر آ رہی تھیں۔

"جی۔ اور یہ شروعات اب ہو چکی ہیں۔"

حسب عادت پیر پٹختی ایما کو لال بھبھوکا چہرہ لیے باہر نکلتے دیکھ کر تیما نے کچن کا رخ کیا تھا۔

"سمجھا لیں اماں اسے۔ نہیں تو میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔"

"تو میں کب چاہتا ہوں کہ تم مجھے چھوڑو۔" وہ بھی پیچھے چلا آیا تھا اور آج یہ پہلی بار ہوا کہ ایما بے اختیار جھینپی تھی۔ کچھ تھا ازمیر کی آنکھوں میں جس نے اسے نظر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہرے۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم۔" نعرہ لگانے کے بعد اس نے ایما کے کان کے قریب سرگوشی کی تھی جسے سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔ ازمیر کے لیے دل کا ہر کونا مسکراتا محسوس ہو رہا تھا۔ چچی جان اس کی والدہ ہیں۔ جنہیں وہ بہت چاہتا ہے اور چاہت تو ایما کے دل میں بھی بیدار ہو گئی تھی ازمیر کے لیے۔ تو جنہیں چاہتے ہیں ان سے متعلق ہر رشتہ چاہنے کے لائق ہوتا ہے سو وہ بھی دل سے سارے واہمے جھٹک دے گی کہ آنے والی عید اس کی خوشیوں کی پیامبر تھی۔

UrduPhoto.com